قیمت ۸ روپے

خصوصی یکجا شمارے

ملی ٹائمز

انٹرنیشنل

نئی دہلی

جنوری ۱۹۹۸ء

موجودہ سیاسی ماحول میں
ہندوستانی مسلمان کیا کریں

ترکی میں اسلامی تحریک
پرشب خون

ملی ٹائمز

انٹرنیشنل

نئی دہلی

فروری ۱۹۹۸ء



چین میں اسلامی
تحریک کی
پیش قدمی
جاری

جدیدیت
دراصل کفر
کا دوسرا
نام ہے

جواں سال انقلابی رمزی یوسف پر امریکی دہشت گردوں کا عتاب

مغرب میں اسلامی
خطرے کا نیا الارم

AUSTRALIA	A$ 4.50	DENMARK	D.KR 17.00	ITALY	LIT 4000	NEW ZEALAND	NZ$ 5.00	SRILANKA	Rs. 50
BANGLADESH	Taka 25	FRANCE	Fr 13	JAPAN	[illegible]	NORWAY	N Kr 15.00	SWEDEN	Kr 20
BELGIUM	Fr 90	FINLAND	F MK 13.00	KOREA	W 2.200	PAKISTAN	Rs. 20	SWITZERLAND	Fr 4
BRUNEI	B$ 5.50	GERMANY	DM 4.50	MALAYSIA	RM 4.00	PHILIPPINES	P 30	THAILAND	B 50
CANADA	C$ 4.50	HONG KONG	HK$ 16.00	MALDIVES	Rf 15.00	SAUDI ARABIA	SR 4	U.K.	[illegible]
CHINA	RMB 16.00	INDONESIA	RP 4.500 (INC PNN)	NETHERLANDS	G 4.50	SINGAPORE	S$ 3.50	U.S.A	[illegible]

آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ مجبور کو نظام جبر سے نجات دلانے کے لئے

اور

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلابی پیغام کو چہار دانگ عالم میں عام کرنے کے لئے

اب

قائد ملی پارلیامنٹ ڈاکٹر راشد شاذ بہ نفس نفیس

ملک بھر میں

سیرتؐ کے عظیم الشان جلسوں سے خطاب فرمائیں گے

دنیا کے مختلف ملکوں اور ملک کے مختلف گوشوں میں سرکار دو عالمؐ کے نام کا غلغلہ بلند کرنے کے لئے ایک جامع پروگرام تشکیل دیا جارہا ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ کوئی بھی قابل ذکر علاقہ سرکارؐ کے پیغام کی گونج سے خالی نہ رہ جائے۔ سال بھر کے لئے ملک گیر سفر کا تفصیلی نقشہ ترتیب دیا جارہا ہے۔ اگر آپ بھی اپنے علاقے کو اس فہرست میں شامل کرنا چاہتے ہیں تو جلد از جلد رابطہ کیجئے۔

یاد رکھئے! سیرت کا جلسہ ایک بڑا اعزاز ہے آپ بھی یہ سعادت حاصل کیجئے! اور اس ملک کو سرکارؐ مدینہ کے رنگ میں رنگ دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیجئے۔

اللہ کی نصرت اور اس کے رسولؐ کی قیادت آپ کے ہمراہ ہے۔

Milli Parliament
Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar New Delhi - 25
Phone : (011) 6827018/6926246 Fax : (011) 6946686

ملی ٹائمز

انٹرنیشنل

نئی دہلی

جنوری تا مارچ ۱۹۹۸ء

خصوصی یکجا شمارے

قیمت: آٹھ روپے

سالانہ زر تعاون: ۱۰۰ روپے

بیرون ممالک سے: ۲۵ امریکی ڈالر

سالانہ زر تعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ ارسال کریں

ڈرافٹ پر صرف اتنا لکھیں

Milli Times International New Delhi

اس شمارے میں...

یکے از مطبوعات مسلم میڈیا ٹرسٹ

ایڈیٹر: محمد احمد سعید

ملی ٹائمز انٹرنیشنل

ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔25

فون: 6926246/6827018

فاکس: (011) 6946686

اداریہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گذشتہ دو ماہ ملی ٹائمز پر بہت سخت گزرے ہیں۔ مٹھی بھر لوگ اور ان کے مقابلے میں منظم و مستحکم نظام کفر جسے ہر لحہ اس چھوٹے سے گروہ سے خوف آتا ہے۔ ایک قیامت تھی جو گزر گئی۔ پھر مالی مسائل نے بھی بحران کی صورت اختیار کرلی۔ دوسرے مسائل ہی کیا کم تھے؟ البتہ جب کشکول خالی ہوجائے تو غیور لوگوں کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ان کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھیں۔

ہمارے لئے ملی ٹائمز اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ مریض کے لئے آکسیجن۔ ہم ہر قیمت پر اس بات کی کوشش کریں گے کہ ملی ٹائمز کی اشاعت ملتوی نہ ہو۔ یقیناً ہمیں نظام جبر کی مخالفت کا سامنا ہے اور مسلمانوں میں صاحب مال لوگوں کو ابھی اس رسالے کی صحیح اہمیت کا اندازہ نہیں ہو پایا ہے لیکن ہمیں اطمینان ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ کوئی معمولی کام نہیں بلکہ آخری رسولؐ کی امت کو نظام جبر کی فتنہ سامانیوں سے نکلنے اور اس ملک کو الہی رنگ میں رنگنے کا انبیائی منصوبہ ہے۔ یقیناً اللہ تعالی ہمیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔ دو ماہ کے عرصے میں ہمیں اپنے قارئین اور بہی خواہوں کے بے شمار خطوط ملتے رہے ہیں۔ ملک کے مختلف گوشوں سے ملی ٹائمز کی خیریت کے ٹیلیفون آتے رہے ہیں اور ہم نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے بہی خواہ مسلسل ہماری حفاظت کے لئے دعاگو رہتے ہیں۔ یقیناً اللہ تعالی ان دعاؤں کو ضائع نہ ہونے دے گا۔

جن لوگوں نے ہندوستانی مسلمانوں کا خواب چرالیا ہے انھیں ملی ٹائمز کا وجود ایک لحے کے لئے بھی گوارہ نہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ ہمارا لفظ لفظ اسی کھوئے گئے خواب کی بازیافت کی کوشش ہے۔ اللہ کا فضل ہے کہ ہماری کوششوں سے ایک قلیل عرصے میں بہت سے دلوں میں امید کی شمع جل اٹھی ہے۔ جو لوگ اب تک مسلمانوں کا سیاسی استحصال کرتے رہے ہیں یا مسلمانوں میں وہ گمراہ لوگ جو رسول اکرم کے سیاسی ایجنڈے کو خیرباد کہہ کر اجنبی سیاسی ایجنڈے کے لئے اپنی قوت صرف کر رہے ہیں اور جو عملی طور پر رسول اللہ کی امت کو چھوڑ کر کفار و مشرکین کی سیاسی امت میں شامل ہوگئے ہیں ان کے لئے ملی ٹائمز کا ایک ایک لفظ ناقابل برداشت ہے۔ گویا ملی ٹائمز پر صرف کفار و مشرکین کی یلغار نہیں بلکہ اسے سیاسی مسلمانوں کی مخالفت کا بھی سامنا ہے۔ ہمیں ان مخالفتوں کی قطعی پرواہ نہیں اس لئے کہ ہمارا مددگار اللہ عزوجل ان سب پر حاوی ہے

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ملی ٹائمز کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کو سرنگ کے دوسری طرف روشنی دکھائی دیتی ہے تو اسے سہارنے اور آگے بڑھانے میں ہماری مدد کیجئے۔ ملک بھر میں اس پیغام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کا آسان اور عملی طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنی جیب سے مختلف لوگوں اور اداروں کے لئے سالانہ چندے جمع کیجئے۔ حسب استطاعت ہر شمارے کی بہت سے کاپیاں احباب کو فروخت کیجئے یا مفت بانٹئے۔ اس شمارے سے رسالے کی قیمت میں اضافہ کیا جارہا ہے اسے خوشدلی سے قبول کیجئے۔ آپ دعوتوں، شادی بیاہ اور نجی ضیافت پر تو بہت پیسہ خرچ کرسکتے ہیں پھر جس مشن سے اس ملک میں آپ کا مستقبل وابستہ ہے کوئی وجہ نہیں کہ اس راہ میں آپ کی جیب سے پیسے نہ نکلیں۔ قیمت میں اضافہ کوئی اتنی بڑی رقم نہیں کہ اس کا شکوہ کیا جائے۔ آئندہ شمارے سے انشاء اللہ چند انگریزی صفحات کا بھی اضافہ کیا جائے گا تاکہ بڑے پیمانے پر ہماری باتیں لوگوں تک پہنچ سکیں۔

ہمیں احساس ہے کہ ہماری بعض معروضات خود مسلمانوں کے اندر بعض حلقوں کو تشویش میں مبتلا کئے دیتی ہیں۔ انھیں اس ملک میں مسلمانوں کی سیاسی صف بندی سے خوف آتا ہے اور اسلام کا انقلابی پیغام خود بعض مسلمانوں کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا ہے ایسا اس لئے ہے کہ وہ گذشتہ پچاس سال سے ایک مصنوعی فضا میں سانس لیتے رہے ہیں۔ ان کے کان انقلابی پیغام سے ناآشنا اور ان کی زبان اسلام کے ذائقے سے محروم ہے۔ گویا کوئی فاقے کا ستایا ہوا مریض ہو جو غذا ملنے پر بار بار اگل دیتا ہو۔ ظاہر ہے جب معدہ ایک مدت سے غذا سے محروم ہو تو وہ آسانی سے غذا قبول نہیں کرسکتا لیکن ہمیں تو ہر حال میں مریض کو غذا کا عادی بنانا ہے کہ اسی میں اس کی زندگی کا سامان ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ملی ٹائمز کے یہ شمارے آج نہ سہی کل ہمارے ذہنی اور روحانی نظام ہضم میں فٹ بیٹھیں گے۔

مسلم سیاسی پارٹی

ملی ٹائمز باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ اگرچہ مانیں تو عرض کروں گا کہ جب سے آپ سے ملاقات ہوئی ہے اور ملی پارلیمنٹ سے متعارف ہوا ہوں، یہ خواہش میرے دل میں موجزن ہے کہ میں سب چھوڑ چھاڑ کر آپ کے یہاں دلی چلا آؤں اور آپ کا اس کار عظیم سنبھالنے میں دست راست بن جاؤں لیکن کچھ ذاتی مجبوریوں کی وجہ سے اس خواہش کو فی الوقت دبائے ہوئے ہوں اور اس کوشش میں ہوں کہ جلد از جلد ان سے چھٹکارا حاصل کر کے خادمان ملت میں شامل ہو جاؤں۔ آپ اللہ رب العزت سے میرے لئے دعا فرمائیں۔

میں دسمبر 98ء کے ملی ٹائمز کے شمارے میں آپ کے استدلال سے یقینا متفق ہوں کہ اب ایک مسلم سیاسی پارٹی کا وقت آچکا ہے۔ آج نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ملک کے تمام صحیح الدماغ و صلح فطرت شہریوں میں یہ خیال پیدا ہو چکا ہے کہ موجودہ سیاسی پارٹیاں نہ تو حکومت چلانے کی اہل ہیں نہ آئندہ ان سے کسی اچھائی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ گذشتہ پچاس سالہ اس پارلیمانی جمہوریت کا اگر ہم جائزہ لیں تو بلاشبہ یہ ملک کو ایک فلاحی حکومت دینے میں بری طرح ناکام ہو چکی ہے اور اب عوام الناس کا اعتماد نہ صرف اس سیکولر ڈیموکریسی پر سے اٹھ چکا ہے، بلکہ انہیں یہ احساس ہو چکا ہے کہ ہندوستان کا قانون جسے دنیا کا بہترین تحریری قانون مانا جاتا تھا، آج انتہائی کمزور اور بے اثر ثابت ہو چکا ہے اور اصل قانون جو عملی طور پر نافذ ہے وہ جنگل کا قانون ہے جس میں جنگلی بھیڑیوں کو کھلی جھوٹ ہے۔ آج ملک میں دو ہی قسم کے طبقے ہیں۔ ایک Exploiters اور دوسرے Exploited پہلے طبقے کی قیادت و کنٹرول برہمن لابی کر رہی ہے جس کو مسلمانوں کا وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا اور وہ اس کو سرزمین ہند سے مٹانے کے درپے ہے اور دوسرے طبقے میں دوسرے پس ماندہ قبائل کے ساتھ مسلمان ہیں جن کی عملی، معاشی اور اقتصادی حالات دن بدن بگڑتی جارہی ہے۔ نہ جان و مال محفوظ ہے اور نہ عزت و آبرو۔ وہ امت وسط جس کو اللہ رب العزت نے انسانیت کی رہنمائی و قیادت کے لئے پیدا کیا تھا، آج اپنا ایجنڈا و مقام و مرتبہ بھول چکی ہے اور ان بھیڑیوں کے لئے لقمہ تر بن چکی ہے۔ آج اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اس امت کو اصل ایجنڈہ سے روشناش کرایا جائے اور اس ملک کے عوام الناس کے سامنے ایک صلح سیاسی جماعت اور صلح نظام حکومت پیش کیا جائے جو اس فرسودہ نظام کا بہترین متبادل ہو۔ میری نیک تمنائیں اور انشاء اللہ خدمات بھی ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گی۔

ڈاکٹر خواجہ نصیر الدین (کرناٹک)

۲

دسمبر کا جریدہ ملی ٹائمز بھی کسی دستاویز سے کم نہیں ہے۔ ہر تحریر اپنی جگہ پر حرف آخر ہے۔ دینی جماعتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جماعت اسلامی کی تبدیلی فکر پر نشاندہی ایک معقول تجزیہ ہے اس کے علاوہ منارہ رسول سے آنے والی صدا میں تو دل کو چھو لینے والی سچائیوں کو سامنے لایا ہے۔ سیکولرزم اور جمہوریت کی تسبیح پڑھنے والے علماء کرام کے سامنے اسلامی تاریخی حقائق کو بہت خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ معارف زندگی اور اس کے بعد ملی ٹائمز بلکہ میں یہ عرض کروں گا کہ ملی ٹائمز کا معیار سب سے بلند ہے کیونکہ اس میں علمی موشگافیاں نہیں ایک تحریک کو پیش کیا گیا ہے جس کا شرف عصر حاضر کے بڑے بڑے علماء کرام کو حاصل نہ ہوسکا۔ ملی ٹائمز کی صحافت الفاظ کی برفباری نہیں بلکہ ایک صحتمند فکر کی وکالت ہے۔ مسلم پارٹی کی واقعتا ضرورت ہے۔ ہمارے آئین میں مسلم حلقوں اور مسلم ووٹوں کو اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ ہم مسلمانوں کے بل پر زیادہ نمائندے نہیں لاسکتے اس کے لئے غور و فکر کی ضرورت ہے۔

ایس خالد مسعود ندوی (نئی دہلی)

۳

اللہ تبارک و تعالی سے دعا ہے کہ عرصہ دراز تک آپ کا و تمام کارکنان ملی ٹائمز کا سایہ امت مسلمہ کو بخیر و عافیت نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ ناچیز نے بھی زندگی کے بیشتر قیمتی اوقات غیر ملی سیاسی جماعت میں صرف کیا جس کی سزا آج امت مسلمہ کو مل رہی ہے جو بیان سے باہر ہے۔ پھر اس یقین کے ساتھ غیر ملی سیاسی جماعت کو الوداع کہنا پڑا کہ ان جماعتوں کی فلاح و بہبودگی کے لئے کوشاں رہنا اپنی دنیوی اور اخروی دونوں زندگیوں کو اپنے ہی ہاتھوں تباہ کرنا ہے۔

اسے میری بد نصیبی ہی کہئے کہ تین سال دلی اور دو سال بریلی میں رہا اور اکثر و بیشتر دورے میں ہی رہا کرتا تھا لیکن کبھی کہیں مجھے ملی ٹائمز نہیں ملا لیکن پچھلے دنوں میں وطن گیا تو وہاں بک اسٹال پر میری نظر ملی ٹائمز پر پڑی۔ لے لیا اور جب مطالعہ کیا تو اس وقت دل کو ایک عجیب سی تسکین و خوشی محسوس ہوئی جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھ لیجئے جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا اور وہ بچ گیا۔ یوں تو اردو کے سینکڑوں رسالے ہیں مگر تمام رسالوں میں سے مجھے کہیں نہ کہیں سے آمدنی حاصل کرنے کی بو آتی ہے۔ بہت سے اخبار بھی ہیں مگر غلامی کی زنجیروں میں جکڑے نظر آتے ہیں۔ ملی ٹائمز مجھے اپنے آپ میں پہلا اور واحد رسالہ لگ رہا ہے جو واقعی امت مسلمہ کے اندر انقلاب لاسکتا ہے۔

محمد افروز عشرت، نیشنل یوتھ لیگ، بریلی

۴

دیگر عرض تحریر اس طرح ہے تقریباً چھ ماہ سے ملی ٹائمز کا قاری بنا ہوں اور جب سے ملی ٹائمز کے شمارے کے لئے بے چین رہتا ہوں۔ آپ کا یہ انقلابی قدم ہندوستانی مسلمانوں کے لئے نئی صبح کا پیغام ہے، میں اللہ تعالی سے یہ دعا کروں گا کہ آپ کو اس اسلامی انقلابی مشن میں کامیابی اور کامرانی عطا فرمائے۔ آمین

میں نے اپنے طریقے سے ان پرچوں کو ترتیب دے کر تقریباً 500 فوٹو کاپیاں بنوا کر سارے ہندوستان میں اپنے جاننے والے اور دوست و رفقاء میں تقسیم کر چکا ہوں۔ میں بھی مسلم سیاسی قوت کے لیے سرگرم ہوں۔

ایس حبیب الرحمن، سعودی عرب

دینی جماعتیں

ماہ دسمبر 1997ء کے شمارہ میں ایک قابل دید مضمون بعنوان "دینی جماعتیں مستقبل کے لئے کیا کررہی ہیں؟" پڑھا اور اسی نتیجہ پر پہنچا کہ ہمارے یہاں دینی جماعتوں میں بس آپسی تناؤ ہے اور وہ یہ نہیں سوچتے کہ مسلمانوں کے ذہن کی تعمیر کس طرح کی جائے اور ان میں سوچنے اور سمجھنے کی قابلیت کیسے لائی جائے۔ آپ کا یہ اتحادی مضمون پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آج کے اس ماحول میں ایسے ہی مضمون کی ضرورت ہے۔

عبدالقدیر، گلبرگہ

پیش ہے تعاون

امت کی اجتماعیت کا مسئلہ اس بحرانی دور میں "جوئے شیر کے لانے" سے کم نہیں۔ پھر بھی توکلاً علی اللہ آپ حضرات کی مساعی جمیلہ نے بہت حد تک آسان کردیا۔ خدا کرے زورِ سعی اور زیادہ۔

خدا کرے امت مسلمہ ہادی اعظم کے طریقہ پر آجائے اور اپنی روایتی و تاریخی اتحاد کا مظاہرہ کرے پھر تو ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم کا نقشہ بدل جائے گا۔ میں اپنی بساط کے مطابق ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں۔ خدا اخلاص کے ساتھ کام کی توفیق عطا فرمائے

پرنسپل مدرسہ اسلامیہ عالیہ بلدیہ، ضلع اررِیہ۔ بہار

ملی ٹائمز

ملی ٹائمز کا ہر شمارہ خوبصورت بھی ہے اور خوب سیرت بھی۔ ہر شمارہ میں ایک اچھوتے پیغام کی تشریح ہے، ایک نئی فکر اور نئی سوچ کی راہ اجاگر ہوتی ہے۔ ملت مسلمہ احساس کمتری اور جہالت جیسے امراض کا شکار ہے۔ جمود بے بسی، بے حسی اور بے عملی کے اس ماحول میں بیداری کی تحریک چلانا ایک قابل ستائش کام ہے۔ ملت کا المیہ سنگین ہے۔ 150 سال پہلے یہی ملت حکمران تھی لیکن آج محکومی کی شکار ملت پس ماندگی کی نچلی سطح پر گئی ہے اور اس کا زوال جاری ہے۔ آزادی کے پچاس سال میں اغیار ترقی کی راہ پر تیزی سے رواں ہیں۔ ملت کو اپنی پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے کوشش اور کاوش کرنا ضروری۔ ملت کے مسائل خارجی نوعیت سے زیادہ داخلی نوعیت کے ہیں۔ سب سے اہم مسئلہ ہے انتشار کا مسئلہ۔ ملت میں نہ مذہبی اتحاد ہے نہ سیاسی اور نہ سماجی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ملت کو اتحاد، نئی سوچ اور نئے عزم اور نئی جدوجہد کی توفیق عطا فرمائے۔

انجینئر محمد احمد علی، گلبرگہ۔ کرناٹک

سیاست نہیں جہاد

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا اور آپ غلبہ اسلام کی کوششوں میں مصروف ہوں گے۔ ملی ٹائمز کے مختلف شمارے پڑھنے سے یہ معلوم ہوا کہ آپ ملک کے موجودہ نظام جبر کو ختم کرکے اسلامی نظام لانا چاہتے ہیں اور جس کے لیے آپ ملک گیر مسلم سیاسی پارٹی بنانا چاہتے ہیں، اسلامی انقلاب کا جو خواب آپ دیکھ رہے ہیں اس خواب کی تعبیر سیاست کے ذریعہ نہیں مل سکتی۔ غلبہ اسلام کے لیے آپ کا یہ جذبہ یقیناً قابل تعریف ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی انقلاب سیاست کے راستے سے آسکتا ہے؟ جب کہ ہمیشہ اسلامی انقلاب جہاد کے ذریعہ سے آیا ہے جس کی واضح مثال ہمارے سامنے چیچنیا کی ہے۔ صرف سیاسی قوت حاصل کرلینے سے اسلام کا احیا نہیں ہوسکتا، سیاسی انقلاب اسلامی انقلاب کا راستہ نہیں ہے کیونکہ سوال اسلام کے سیاسی غلبہ کا نہیں بلکہ اسلام کی بقا اور اس کے استحکام کا ہے۔

اگر آپ کو اس ملک میں سیاست کے ذریعہ اقتدار مل بھی جائے تو اس سے اسلام اور مسلمانوں کو کیا فائدہ ہوگا؟ جس طرح ترکی میں اربکان کو حکومت کرنے سے روک دیا گیا یا آج جو الجزائر میں مسلمانوں کے ساتھ ہورہا ہے کیا اس طرح کا کوئی واقعہ آپ کے ساتھ پیش نہیں آسکتا؟ ماضی کے تجربات کا اعادہ کرنے سے کیا فائدہ؟ بلکہ ہمیں چاہیے کہ ہم ان تجربات کی روشنی میں اپنا لائحہ عمل تیار کریں۔

آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم سیاست کے ذریعہ مسلمانوں کے مسائل حل کریں گے، انھیں ہر سطح پر آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے، ملک میں امن و امان قائم کریں گے لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم سیاسی پارٹی کے ذریعہ اس ملک میں خلافت کا نظام قائم کریں گے۔

کیونکہ ہر دور میں اسلامی انقلاب صرف اور صرف جہاد ہی کے ذریعہ سے آیا ہے لہٰذا آپ امت مسلمہ کے دلوں میں جہاد کی روح پھونکیے اور جہاد ہی کے راستے سے اپنی منزل مقصود کی طرف قدم بڑھائیے۔ تب انشاء اللہ ضرور رب کائنات کی مدد ہمارے شامل حال ہوگی۔

ظلِ ہما، سعید آباد، حیدرآباد

فروغ تعلیم کے لیے ملی ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کا مربوط تعلیمی مشن

ماہ جنوری 1996ء میں قومی تنظیم ملی پارلیامنٹ کے پٹنہ اجلاس کے بعد جناب مختار صدیقی، رکن ملی پارلیامنٹ کی تحریک پر ملت کے کچھ دردمند افراد مراد آباد میں جمع ہوئے اور باہمی گفت و شنید کے بعد ملی ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ جسے سوسائٹیز رجسٹریشن ایکٹ کی دفعہ نمبر21، 1860 کے تحت رجسٹرڈ کرالیا گیا

الحمد اللہ فاؤنڈیشن نے اپنے کام کا آغاز گذشتہ سال مراد آباد کے پس ماندہ آباد والے علاقے کرولہ میں ایک انگلش میڈیم اسکول کے قیام سے کردیا ہے اور اب لڑکیوں کے لئے ایک رہائشی انٹر کالج اور ایک یونانی میڈیکل کالج کے قیام کے لئے سرگرم عمل ہے۔ جسکے لئے سب سے پہلا مرحلہ زمین کی خریداری کا ہے جس کی تکمیل کے لئے قوم کے دردمند صاحب حیثیت اصحاب سے بھرپور مالی تعاون کی اپیل ہے۔ جو "ملی ایجوکیشنل فاؤنڈیشن" کے نام چیک یا ڈرافٹ کی شکل میں براہ راست "کنارہ بینک" کٹرہ برانچ مراد آباد کو روانہ کی جاسکتی ہے۔ جملہ تفصیلی معلومات اور خط و کتابت کے لئے معاون سکریٹری محمد عاصم صدیقی، اپوزٹ وارثی بلڈنگ، جھبو کا نالہ، کرولہ

Membership Form

for a Proposed

Muslim Political Party

Form No.: ____________

Date.: ____________

ملک میں عنقریب ایک مسلم سیاسی پارٹی تشکیل دی جانے والی ہے۔ جو ہندوستانی مسلمانوں
کی سیاسی صف بندی کے ذریعہ اس ملک میں اللہ کا کلمہ بلند کرے گی۔ مسلمانوں کی موجودہ
سیاسی بے سمتی کا خاتمہ ہوگا اور پچاس سالہ سیاسی غلامی کی زنجیریں کٹ جائیں گی۔ اگر آپ
اس پارٹی کے مقصد سے اتفاق کرتے ہوں اور اس ملک میں منجمد اسلامی ایجنڈے کو دوبارہ
متحرک کرنا چاہتے ہوں تو یہ بتائیے آپ اس سلسلے میں کیا کرسکتے ہیں۔ آج ہی اس فارم کو پر کیجئے
اور اللہ کا نام لے کر ہمیں ارسال کردیجئے۔

Photo

Name: ____________ Fathers Name: ____________ Age: ______

Educational Qualification: ____________

Permanent Address: ____________

Address for Correspondance: ____________

Phone: ____________ Phone Office: ____________ Phone Res.: ____________

Health Condition ☐ Ecellent ☐ Good ☐ Poor

Languages Known ☐ English ☐ Urdu ☐ Hindi ☐ Other

عہد نامہ

میں اس مشن کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کردینے کا عزم کرتا ہوں۔

خصوصیت کے ساتھ میں ہر روز ☐ گھنٹہ اس مشن کو دوں گا۔ میری خدمت درج ذیل کاموں کے لئے پیش ہے:

اطراف میں سفر ☐ علاقے میں چھوٹے چھوٹے پروگرام منعقد کرنا ☐ لیف لٹ تقسیم کرنا اور اشتہار لگانا ☐

علاقائی زبان میں مسلم پارٹی کے لٹریچر کا ترجمہ کرنا ☐ مقامی طور پر لٹریچر کو طبع کرانا ☐ اس مشن کے مالی تعاون کے لئے اہل ثروت کو آمادہ کرنا ☐

ملی ٹائمز کو بڑے پیمانے پر لوگوں تک پہونچانا ☐ عوامی رابطے کا پروگرام منعقد کرنا یا کوئی اور خدمت: (تفصیل لکھئے)

____

____

____

Milli Parliament

Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

Tel: +91-11-6827018, 6926296 Fax: +91-11-6946686

مسلمو الهند

مصابون بالردة الفكرية والعملية منذ السنوات الخمسين الماضية

نص الكلمة الرئاسية المثيرة للفكر التى ألقاها قائد البرلمان الملّي الدكتور راشد شاذ بالدورة الدينية فى هُبْلى

ألقى قائد البرلمان الملّي الدكتور راشد شاذ كلمة مفصلة وهو يصدر "الميثاق الإسلامي" فى الدورة الدينية المنعقدة فى ٢ - ٣ مارس ١٩٩٧ بهُبْلى . وقد نقلنا هذه الكلمة عن شريط التسجيل وبدون حذف أو إضافة وذلك لأجل المحافظة على صورة الخطاب الأصلية

مسلمو هذا البلد المقهورون المضطرون !

أيها الإخوة والأخوات !

ستصيبكم حيرة لو قلت : إن تاريخ اليوم هو ١٦ سبتمبر ١٩٤٦ وليس ٢ مارس ١٩٩٧ !. ومهما كان هذا الأمر محيرا لكم إلا أنه حقيقة، وهى أنه قد ضاعت من تاريخنا الملي نحو (٥٠) سنة. نحن نرى أننا كنا غافلين تماما عن برنامجنا الملي - كأمة - خلال السنوات الخمسين السابقة .

وبينما كانت أقوام أخرى تجاهد ليل نهار لتنفيذ برامجها القومية والطائفية، وبينما كان السياسيون المشركون الماكرون الداعون إلى نظام الكفر نشطون كل لحظة لتنفيذ مآربهم النجسة، تم إغفال البرنامج الملي لدرجة أن أمر اكتشافه يستعصى الآن ليس على عامة الناس بل حتى على نخبتنا .

ولا ينحصر الأمر في غفلتنا المجرمة عن برنامجنا الملّي، بل قد تقدمنا واحتضنا برامج أعدائنا واعتبرنا أهدافها بمثابة أهدافنا فأهدرنا طاقاتنا فى سبيل تحقيقها . والنتيجة هى أننا لم نحرز تقدما فى السنوات الخمسين السابقة بل نحن لا نتمتع حتى بذلك الوضع الذى كنا نتمتع به قبل خمسين سنة من الآن . هذه هى أوراق تاريخنا الملي التى نطلق عليها وصف "الأوراق الضائعة" .

إن أثمن شئ فى حياة الشعوب - بعد رأسمالها الأيديولوجي - هو مقدرتها على استغلال وقتها . إن الشعوب الحية ترقب تقلب الزمن، وهى تجيد فن استغلال الوقت بحذاقة وهى تتمتع بملكة استباق الأحداث وتخطيط المستقبل عبر قرون قادمة .

إنه يمكنك استعادة الأرض والثروة لو سُلبتا منك . وفى هذه الأرض نفسها قد استعاد أسلافنا مرارا أمجادنا السليبة . ولكن لو سُلبت من أمة ما خمسون سنة من عمرها فهى خسارة من الصعب تلافيها . ولا يمكن تعويضها إلا لو نشأت فينا عزيمة تحويل (المستحيل) إلى (الممكن).

إنه من الأمور المشجعة لهمم الذين يقطنون هذا البلد اليوم أنهم يعيشون عصرا يشهد بداية الجهد المضني لتحويل وجهة مسلمى الهند وجهة إلهية . إنهم يتواجدون فى مرحلة تاريخية سعيدة حيث دق ناقوس المسيرة الملية فى ظل ميثاق إلهي خالص بعد الاعتراف بالأخطاء السياسية عبر الخمسين سنة الماضية ..

فهنا - اليوم - تقوم جماعة من المسلمين ضعيفة ولكن عالية الهمة بإصدار ميثاق إسلامي للمائتين والخمسين مليون مسلم فى هذا البلد . إن إصدار "الميثاق الإسلامي" فى هذا الاجتماع الصغير فى هُبلى حدث هام فى تاريخنا الملي .

إن ليل الضباب الأيديولوجي ينتهى بنشر هذا الميثاق . إنه لن يمكن للآخرين إلهاءنا ببرامج غير إسلامية بعد الآن بعد ظهور هذا البرنامج الإسلامي . إن مسلمى الهند قد تكفلوا بدفن النظام البائد على المستوى الأيديولوجي على الأقل . إنه أول حدث فى تاريخنا الملي لاعتمادنا على كتاب الله وسنة نبيه وحدهما محورا ومركزا لحل كل مشكلاتنا .

وحين شوهدت آخر صرعات الموت فى جثة العلمانية فى ٦ ديسمبر ١٩٩٢ عرفنا كأمة مسلمة أنه لا قوة فى هيكل العلمانية الميت حتى نستغيث بها .. لقد طلع يوم ٦ ديسمبر كيوم الإدراك والوعى للأمة كلها . إن الحاجة تقتضى أن نكون يقظين حتى لا يحاول مشعوذو العلمانية حجب الحقيقة التى برزت لنا كالعيان ..

اليوم تحتفل الشعوب الأخرى فى هذا البلد بعيد الحرية الخمسين.. ومن المشكلة بمكان أن يقتنع المسلمون أنفسهم بجدوى الاشتراك فى هذا المهرجان .

لقد قيل لنا : إننا مواطنو بلد حر وإننا شركاء فى وسائل البلد.. أى أننا جالسون مع الآخرين على نفس مائدة الطعام ولكن من يخبرهم بأنه بينما تقدم أنواع من أطباق الطعام على المائدة لم تكن من نصيبنا إلا الرائحة .. ثم يقال لنا : إنكم

أحرار ! بينما الحقيقة هي أننا لا نستطيع أن نصف الانتقال من حكم سياسي معين إلى حكم سياسي آخر بأنه "حرية" .

أما (الحرية) بالنسبة للمسلم فلن نكون أحرارا فى نظر الشريعة ما لم نتخلص من النظام غير الإلهي وما لم نتحرر من القوانين غير الإلهية وما لم تنشأ بيئة حيث يسجد عبادُ الله لإلههم وحده لا غير .

إننا معرضون لطوفان دعائي ضخم منذ الخمسين السنة الماضية. فيقال لنا أحيانا : إننا مواطنون أحرار بدولة حرة ونحن نبدأ فى الإيمان بهذا القول . وأحيانا يقال لنا : إننا "أقلية" فنؤمن بهذا الكذب. ولا يوجد مثال آخر للخداع فى العالم حيث تُحمل أمة يبلغ تعدادها (٢٥٠) مليونا من البشر على الاعتقاد بأنها "أقلية" .

والحقيقة هى أن الدعاية تملك قوة ضخمة . ولو تعرض المرء للدعاية صباح مساء فلا بد من أنه سيؤمن بها رويدا رويدا . وهؤلاء الذين حملوا المسلمين على الاعتقاد بأنهم "أقلية" وبأن الهندوس "أكثرية" فى هذه البلاد، قد استخدموا كل الألاعيب والحيل لتحقيق أغراضهم، لدرجة أنهم وصفوا "الهندوسي" فى الدستور على أنه كل من لا ينتمي إلى ديانة كذا وكذا ! هذا رغم أن وثيقة هامة - كالدستور - لا تسمح بالتعريفات الفضفاضة . لقد استغلت أقلية "البراهمة" - التى تبلغ نسبتها (٧) فى المائة من السكان - هذا التعريفَ لحكمها على البلاد منذ الخمسين سنة الماضية.

وقد أخذت الحالة تتغير الآن . ولكن لو ظن المسلمون أن عافيتهم تكمن فى الخروج من حكم البراهمة والانضمام إلى ناخبى المنبوذين والطبقات الدنيا، فإنهم لن يروا انبثاق فجر جديد . لقد سمحنا للبراهمة باستغلالنا حتى الآن، والآن سنسمح للطبقات الدنيا باستغلالنا ! إنه ليس هناك من فرق عندى بينهما. إنهما صورتان مختلفتان للعبودية السياسية . وهذا تحليل عقلي ومنطقي للوضع. وعلينا كمسلمين أن نرى : هل عملنا هذا يطابق أحكام الله ورسوله أم لا ؟

ولو أردنا تنظيم أنفسنا فى ضوء برنامج إسلامي فعلينا أن ندرس: هل كان ما عملناه خلال الخمسين سنة الماضية جزءا من برنامجنا الإسلامي أم لا ؟

إن قيادتنا الإسلامية الدينية والمليّة غافلة تماما عن البرنامج الإسلامي وهى نشيطة فى تنفيذ برامج الآخرين . وللأسف فإن كبار قادتنا ليسوا بمدركين ضلالهم، مع أنك لو تحدثت إلى أي عالم فستجد أنه يعترف بأنه لا يوجد أسلوب حياة مقبول إلا الإسلام .

وسواء أكانت هى خطبة الجمعة أو العيدين نحن نجد الخطيب يدعو بصخب وقوة : "اللهم أعزّ الإسلامَ والمسلمين"، ولكن حين يحين موعد العمل يتم إصدار الفتاوى بأن نؤيد السيد / ديوى غاؤدا أو السيد / لالو براساد أو السيد / كيسرى . العياذ بالله !! ما هذا الهراء؟ إنك تقول بلسانك : يا إلهي أعزّ الإسلام..! قوّ الإسلام ..! ولكنك تعمل بما يقوّى الكفر .! إنها ازدواجية وتعارض أصيبت بهما الأمة منذ الخمسين سنة الماضية .

إن البلد يزخر اليوم بعدد لا يحصى من أهل الفكر والنظر. ولكنك لو تحدثت إلى أحد منهم فسوف يتضح لك بعد لحظات أن الشخص مصاب بالانفصام الفكري . إنه يعترف بشئ على مستوى الإيمان والعقيدة ولكنه يؤمن على مستوى العمل بأن ذلك الشئ غير مقبول أو غير عملي، ولذلك يبحث لنفسه عن مخرج آخر .

ثم عليك أن تلاحظ أن عددا لا يحصى من المؤسسات العلمية والحركات الدينية ينشط فى هذا البلد. هل لديها خطة عمل ؟ هل هى تبصر طريقا تريد هداية بلدنا إليه ؟ ولو كان هناك من يرى مثل هذا الطريق فعلينا كلنا أن نتبعه . ولكن حتى لو لم يكن هناك من يتمتع بهذا الإدراك فهو من متاعنا وثروتنا . ولو كان هناك من يعمل للدين انطلاقا من طاولة صغيرة فهو الآخر ثروة قيمة لنا . ولو كان هناك من يفتح مدرسة أو يدير كلية أو يقوم بأي عمل آخر يرى أن تغيرا ما سيحدث بفضل ذلك العمل فى السنوات القادمة، فهو ثروة ثمينة لنا .

ولكن علينا أن نلاحظ ونفكر : هل نحن نحصل على "توجه" و"اتجاه" بفضل هذه الأشياء أم لا ؟ هل هى ستؤدى إلى بزوغ فجر الثورة أم لا ؟ هناك حاجة إلى اختبار ذلك الشئ وملاحظته . لا نستطيع أن نبرأ بالقول بأن الجماعة الفلانية تقوم بذلك العمل، إذن ما علاقتنا به ؟! علينا أن نتقدم بمفهوم أن هؤلاء كلهم جزء من أمة رسول الله وأنهم جزء من الحركة الثورية . ولو كان رواحهم وغدوهم لا يؤدى إلى انبثاق صبح المستقبل فعلينا أن نتفكر فى ذلك.

والشئ الآخر هو أن يتعين بصورة واضحة عند إعداد أي برنامج عمل أو تحديد الطريق أننا نعتمد كليا على هدى الله ورسوله .

إن برنامج المسلمين وخطتهم حول أية قضية لن يكونا نتاج فكرنا بل سنرى ماذا يقول كتاب الله وسنة رسوله إزاء تلك القضية؟ إنني أصاب بحيرة حين أرى أن هذه الأمة ضائعة مع تملكها كل هذه الكنوز الفكرية .

وأنا إن لم أقل كمسلم فأنا أقول كدارس للقرآن : إن القرآن فى حد ذاته خط حي . إنك ستصاب بهزة لو وضعتَ يدك على هذا الخط . إنه كتاب فى غاية العجب . وكيف يجوز لأمة تملك هذه الثروة الثورية العظيمة أن تكون لها أربعة آراء حول أية قضية ثم لا يجتمع الناس على أي منها.

وحال القيادة الدينية العليا هى أنها تجتمع للتباحث حول أية قضية ولكنها تعجز عن وضع أي برنامج للعمل الاجتماعي. وكيف يحدث هذا بينما هناك تعليمات واضحة حول المبادئ الأساسية ؟ ما هو الشئ الذى يمنعنا لكى نتخذ موقفا موحدًا ؟

أنظروا على سبيل المثال : حين تحين فرصة الانتخابات النيابية هناك ثلاث خيارات أمام المسلمين : أن يصوتوا للجبهة المتحدة أو لحزب المؤتمر أو لحزب الشعب الهندي (الهندوسي). ويعقد أكثر مؤسسات المسلمين تمتعا بالاحترام، وهو مجلس قوانين الأحوال الشخصية الإسلامية، ولا يصل إلى أساس متفق عليه بعد ساعات من النقاش الطويل . وأخيرا يقررون أن المجلس ليس له موقف بهذا الشأن بل لكل أعضائه أن يقوموا بما يرونه مناسبا .

فالحقيقة هى أن أذناب كل هؤلاء منغرزة هنا أو هناك ... فأذناب البعض مربوطة بـ جاناتا دال. والبعض يرى أن نجاته فى يد حزب المؤتمر بينما البعض الآخر يرى أنه من عناصر حزب المؤتمر بصورة تقليدية . هذا هو الوضع الذى أمامنا .

والحقيقة هي أنه قد تم اختطاف القيادة الملية بكاملها على أيدي الكفار والمشركين .. أى أن الذين نعتبرهم قادتنا الملّيين وننتظر منهم الهداية فى ضوء الكتاب والسنة هؤلاء قد اعترفوا بكافر ومشرك قائدا سياسيا لهم . والنتيجة هى أننا لا نصل إلى قرار إجماعي حول أية قضية .

إنه من الواجب أن نكون واضحين حول بعض الأمور بصورة مبدئية . وكتاب الله وسنة رسوله يقدمان لنا تعليمات غاية فى الوضوح فى هذا الخصوص . **إن الإسلام ليس بدين يرضى بوجود الكهانة، كما أنه لا توجد عندنا طبقة المشايخ على غرار "البانديت" البرهميين الذين تعطيهم الهندوسية حق احتكار تفسير الدين وشرحه** .. بل نحن نؤمن بكتاب الله الذى قد أرسل بواسطة الرسول، وكل أفراد الأمة يشاركون بدون استثناء فى مسئولية إقامة هذا النظام باستخدام كل ما لديهم من قوة .

ولا يمكننا أن ننجو بأنفسنا يوم الحشر بالزعم بأن علماءنا أو قيادتنا السياسية أجبرونا على اتباع الكفار والمشركين .. فكل منا سيقدم حسابه بنفسه .

لقد مرت خمسون سنة على استقلال الهند فماذا فعلتم خلال هذه السنوات ؟ لقد بايعنا محمدا صلى الله عليه وسلم، فكيف قبلنا أن نعقد بيعة ثانية مع (ملائم سينغ) أو مع (لالو براساد يادَو) ؟ لا يمكن أن يحدث هذا .. إذ يجب أن نكون واضحين حول مَن سيكون قائدنا .

هل يجوز للمسلمين – شرعا – بعد بيعتهم مع الرسول أن يبايعوا شخصا آخر لديه برنامج مختلف؟ إنني أرى أن هذا غير جائز . إن بيعتنا مع الرسول تنفسخ حين نعترف بالكفار والمشركين قادة سياسيين لنا .. ونحن للأسف لا ندرك هذه القضية الدقيقة .

إن علينا اتباع أسوة رسول الله بصورة كلية .. فلا يوجد جانب من الحياة لا نجد بشأنه هداية واضحة من الرسول . ونحن نقول – بل وحتى عامة المسلمين يقولون بصورة واضحة – بأن ندخل فى دين الله بصورة كاملة عملا بالأمر الإلهي : "أدخلوا فى السلم كافة" .

إنه لا يمكنك أن تقول : إن إمامة المسجد لرسول الله حيث ستقام الصلوات حسب هدايته أما خارج المسجد فالاتباع للكفار والمشركين وقضاء الحياة حسب طرقهم وتعاليمهم . إن هذا لا يمكن أن يُقبل به . فنحن حين نرتكب هذه الازدواجية تنفسخ بيعتنا مع الرسول .

ولو درسنا أوضاعنا الحالية فسنجد أن الأمة بكاملها مصابة بردة كبيرة . لعلكم سمعتم أن المسلمين تحت مظلة مجلس الأحوال الشخصية الإسلامية قد قاموا بحركات كبيرة ونزل المسلمون إلى الشوارع تحت شعار "الحفاظ على الشريعة" وكانوا يرون أن شريعة الله أهم من صيانة أحوالنا وأوضاعنا فى هذا البلد .. ولهذا غامرنا بأرواحنا وقمنا بحركة المحافظة على الشريعة .

وقد قيل لنا : إننا سنصبح مرتدين لو لم نفصل فى أحوالنا الشخصية فى ضوء شريعة الله ولو استعنا بنظام آخر غيرها لحل قضايا النكاح والطلاق والوراثة .. وقيل لنا : إنه من الواجب الحفاظ على قوانين أحوالنا الشخصية لكى نبقى على إسلامنا ..

والقضية التى تثور هنا هى : هل شريعة الله نزلت للهداية فى قوانين الأحوال الشخصية وحدها أم أنها شريعة واسعة النطاق تعلمنا أسلوب قضاء الحياة بأكملها ؟ فكيف يمكن إذن أن نترك الفلسفة السياسية لرسول الله وأن نضرب بالحائط المنهج الاقتصادي والسياسي الذى يعلمه الإسلام لنا، ونتبع الكفار والمشركين .

إنها ردة مكشوفة أننا نبذنا الطريق الذى علّمه لنا رسولُ الله واخترنا نظام حياة آخر وأننا نفخر بأننا مواطنون علمانيون مؤقرون بهذا البلد . أنظروا ! إنه لا سبيل لقضاء الحياة وفقا للإسلام إلا باتباع تعاليمه .. وكل ما عداه من مناهج ونظم فهى باطلة ومرفوضة لدينا . وهذا إيماننا .

واجتماع اليوم اجتماع ديني نحاول فيه أن ندرس كيف ضاعت حياتنا الدينية خلال السنوات الخمسين الماضية وكيف تشوشت قيمنا الدينية وكيف اختلطت أفكارنا بأفكار أخرى . لقد حاولنا فى نقاشاتنا فى هذا الاجتماع أن ندرس كيف ننظم حياتنا الدينية وكيف نتناول هذه القضية بالفكر والنظر . وبما أننا قد اجتمعنا هنا لهذا الغرض فأنا أريد أن أتساءل : هل هناك مجال – أيها الإخوة والأخوات – أن يقول المسلم "إنه علَماني" ثم يبقى مسلما في الوقت نفسه ؟

وهل العلمانية مقبولة للمسلمين كفكر سياسي ؟ إن الشريعة تقول: إننا لا نستطيع أن ننحرف قيد شعرة عن الفلسفة السياسية وعن برنامج العمل الذى أعطاه رسول الله لنا . فكيف إذن نقبل بالعلمانية كأيديولوجية سياسية ونزعم أننا نؤمن بمنهج الرسول ؟ إن هذا مستحيل .

لقد دأبت قيادتنا – دينية كانت أم سياسية – أن تحملنا على الاعتقاد خلال السنوات الخمسين الماضية بأن نظام الحياة المناسب والعملي الوحيد فى هذا البلد هو العلمانية وأن على المسلمين أن يبذلوا قواهم لإقامة البنيان العلماني وتقوية هيكله.

أليس الأمر أننا حين نقول أن النظام العلماني هو النظام العملي الوحيد للمسلمين فى هذا البلد، فنحن نقول بكلمة أخرى: إن كتاب الله لم يعد ذا موضوع للهداية فى هذا البلد وأنه من أساطير الأولين التى يريد البعض اتخاذها أساسا للمجتمع وأن الأمر مختلف هنا فى هذا البلد حيث لا مجال إلا للمجتمع العلماني . لقد دأبت كبرى قياداتنا على إقناعنا بأن نجاتنا تكمن فى العلمانية وحدها . إنها ردة فكرية عظيمة .

وإن كانت هذه الأمة تبحث اليوم عن اتجاه حقا، فيجب أن نكون واضحين حول ما نريد أن نقوم به فى هذا البلد . فإن كنا – كمسلمين – نريد أن نحافظ على وضعنا كأقلية وأن نحصل على بعض المزايا الخاصة وأن نفوز ببعض التأكيدات وأن نكون مطمئنين بالحصول على حقوقنا كأقلية، فسأقول: إن هذا انحراف عن التوجه القرآني لأن القرآن لا يريد أن يراك فى وضع "الأقلية" بل القرآن يقول لكم إنكم مسئولون بعد رسول الله عن أن تقيموا نظاما عادلا فى هذا البلد على أساس القرآن. هذا هو برنامج عملنا. وعلينا أن ننظر : هل نحن حقا نتبع هذا البرنامج أم لا ؟

إنني أرى أن كل ما قمنا به خلال السنوات الخمسين الماضية هو انحراف عن هذا البرنامج . لقد قمنا بحملات للمحافظة على الشريعة. فهل أنزلت شريعة الله لنتم (المحافظة عليها) أم لكى نسعى لتحقيقها وتنفيذها على أرض الواقع ؟ يا عباد الله !– لم تنزل الشريعة للمحافظة عليها بل قد أنزلت لتنفيذها ! فلِمَ لا تقومون بحركة لتنفيذها؟

وهذا هو الانحراف الذى بسببه ضلت قافلتنا الملّية . والنتيجة أنه توجد لدينا تأويلات كبيرة .. فنحن نقول : إن الأوضاع سيئة للغاية ! لعل الوقت لم يحن بعدُ فى هذا البلد لنقول مثل هذه الكلمة الكبيرة . وأنا أقول لكم : إنه أمر الله وأمر رسوله أن تقولوا كلمات كبيرة وخطيرة وإلا لن نظل على إسلامنا .

ولو رأينا – ولو للحظة واحدة – أن القرآن لا يكفى للهداية فى هذا البلد وأنه علينا أن نبحث عن طريق آخر وعن أسلوب آخر فى هذا البلد فإننا نظن أننا أكثر ذكاء وفطنة من الله ورسوله . وهذه الحكمة هى التى دفعت البعض منا ليقول حين واجهتنا ثلاث خيارات كافرة، أن نختار "الشر الأدنى" .

وأنا سألت بعض هؤلاء : هل لو كان أمامك ثلاث خيارات هى الزنا وتناول الخمر وقتل شخص ما فأي شر أدنى ستختاره ؟ يا عباد الله !ـ علينا أن نرفض كل هذه الخيارات الثلاثة وأن نفكر فى الخيار الرابع .

عليكم أن تمعنوا النظر : إلى أين وصلنا برحلتنا السياسية هذه عبر السنوات الخمسين الماضية؟ الحقيقة هى أننا لم نصل إلى أي مكان بل نحن ندور فى حلقة مفرغة : أن نعطى السلطة لهذا الكافر اليوم ثم نعطيها غدا لذلك الكافر . هذا رغم أنه حرام للمسلمين فى ضوء الشريعة أن يعترفوا بالكفار والمشركين حكاما لهم أو مسئولين عن شئونهم .

إن آية قرآنية تزين الجدار أمامكم تقول : "ولن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا" أى أن الله لن يسمح أن يصبح الكفار والمشركون حكاما على المسلمين .. فكيف أمكن أن نقبل بهؤلاء حكاما سياسيين علينا بكل رضانا ورغبتنا ؟

ولو كنا نريد حقا أن نحيا حياة إسلامية فى هذا البلد وأن ننظم قوانا مرة أخرى، فعلينا أن نبحث عن التعاليم الواضحة من رسول الله صلى الله عليه وسلم .. أى أن عملية إعادة التنظيم وصياغة الحكمة العملية لن تتم وفق عقلي وعقلك بل فى ضوء حكمة الرسول العملية الثورية . وعند ذلك فقط سيكلل سعينا بالنجاح .

ولو كنا نريد حقا أن نحظى بالطمأنينة الكاملة بهذا الخصوص، ولو كنا نعتقد أننا نريد أن نبقى على إسلامنا، ولو كنا نريد أن نخرج من الردة الفكرية التى دخلنا فى متاهاتها، فهى قضية فكرية كبيرة وعلينا أن نفكر فى كيفية تحويلنا مرة أخرى إلى (مسلمين) .

أنظروا ! هناك أشياء واضحة جدا ولا أعرف كيف لا يراها البعض. لقد قيل لنا : إن هذا بلد ديموقراطي وجمهوري، وقيل لنا كذلك : إن الديموقراطية والجمهورية جزء من الإسلام أى أنها عقيدة مقدسة علينا المحافظة عليها .

ولعلكم رأيتم أن فى انتخابات أوتاربراديش السابقة كان علماء المسلمين ومفكروهم وعناصرهم السياسية – بل وأنا أظن أن البعض من المخلصين حقا – كانوا يسعون أن تعقد الجبهة المتحدة وحزب بإهوجان ساماج [حزب المنبوذين] اتحادا ما . وبذل إمام المسجد الجامع بدهلى كل قوته لأجل دعم هذا الاتحاد وخرجت قوافل المسلمين لتقوية القوى العلمانية وقاموا بدعايات منظمة لها .

من قال لكم : إن الديموقراطية والجمهورية عقيدة لا بد لكم منها؟. إن الديموقراطية – ببساطة – هى حكم الأغلبية وأنتم تعرفون جيدا مَن له الأغلبية فى هذا البلد ! فلِمَ إذن تفكرون بإقامتها وتسعون لتقويتها ؟ إن الله ورسوله لم يكلفكم بتقوية الديموقراطية العلمانية فى هذا البلد . فلم إذن تعنون بها وتسعون لنجاحها .

أنتم تتوجهون إلى مراكز الاقتراع . إن شبابكم يتلقون الرصاصات فى صدورهم فى هذا البلد . ثم تقفون فى حر الشمس أربع ساعات وخمس ساعات لإعطاء صوتكم الذى سيقوّى حكم الكفار والمشركين عليكم . ما هذا الذى يجرى ، يا عباد الله ؟ فى ضوء أية شريعة تجرى هذه الأشياء ويتم تحملها ؟. إن علينا أن نسأل أنفسنا، وعلى الأمة كلها أن تحاسب نفسها .

إن كثيرا من الألاعيب والمسرحيات يجرى إخراجها للتمويه علينا. وعلى سبيل المثال : تم انتخاب مسلمَين لتولى رئاسة الجمهورية الهندية . وهناك اهتمام بإدخال "مسلمين" إلى كل وزارة ليكون هناك تمثيل للمسلمين فى كل حكومة . والسبب فى هذا هو الحيلولة دون إدراك المسلمين بالنكسة التى أصيبوا بها فى السنوات الخمسين الماضية والمحكومية السياسية التى يرزحون تحتها . فلو أدركوا هذا لدفعهم الإحباط إلى التفكير فى حالتهم وإلى الخروج إلى الشوارع .

ولهذا يتم تنصيب (جعفر شريف) وزيرا أحيانا ويظهر أمامنا شخص يسمى (إبراهيم) أحيانا أخرى.. وأنا أسألكم : هل هناك من فرق بين الوضع الذى كنا نعيشه عندما كان (جعفر شريف) وزيرا للسكك الحديدية وبين الوضع الذى نعيشه الآن حين يتولى هذه الوزارة شخص غير مسلم يسمى (باسوان) ؟ فهل بدأ الأذان على محطات السكك الحديدية ثم توقف الآن ؟ فلِمَ إذن تظنون أن هناك تمثيلا لكم فى الحكومة حين يدخلها شخص من أمثال (جعفر شريف) أو (إبراهيم) ؟

لابد أنكم رأيتم أنه حين لم يحصل (سكندر بَخت) على حقيبة وزارية جيدة فى حكومة حزب الشعب الهندي، تملكه الغضب حتى ظهر للعيان واستمر التليفزيون أياما يعرض هذه المهزلة .. ولم يشعر مسلم ما بالتعاطف مع (سكندر بَخت) والتمنى لكى يحصل على حقيبة وزارية أفضل . وإن كنا واضحين هذا الوضوح فى ما يتعلق بسكندر بخت المنتمىَ إلى حزب الشعب الهندي فكيف نسلم بآخرين من أقران (سكندر بخت) فى الأحزاب الأخرى بأنهم ممثلون لنا ؟. إن علينا أن نفكر فى هذا الأمر .

ثم يجب أن نكون واضحين بأن ممثلنا فى هذا البلد هو ذلك الشخص الذى يريد إحداث تغيير فى هذا البلد فى ضوء البرنامج الإسلامي .. أى أن الشخص الذى يسلم بكتاب الله دستورا عمليا للحياة ويسعى لتنفيذه هو ممثلنا .

أما لو كان من أحد يريد تنفيذ برنامج (جاناتا دال) فلن يكون ممثلنا .. وكذلك لو كان شخص ما يمثل الحزب الشيوعي فلن يكون ممثلنا .. وذلك لأنه لابد لمن يتصدى لتمثيلنا ألا يعمل لأي برنامج آخر بل أن يتحرك لبرنامج العمل الإسلامي وحده .

إنه حرام – وبصورة قطعية – على المسلمين أن يشاركوا فى حزب كهذا أو أن يسعوا من أجله أو لتمكينه من السلطة، وذلك لأنه يعمل لبرنامج عمل يتعارض مع برنامج عملنا . وعلى سبيل المثال: يطالبنا القرآن المجيد بأن نعمل لإنشاء نظام عادل فى هذا البلد . ولكم أن تطلقوا على نظام كهذا وصف "الخلافة" أو "نظام المصطفى" أو أي وصف آخر ولكن المسلمين مطالبون بصورة أساسية بأن يعملوا لإنشاء "الخلافة"

ليس فى هذا البلد فقط بل وفى كل أنحاء العالم . هذه هى مطالبة القرآن .

إن القرآن يطالبنا بأن نوجه وجهة المجتمع نحو القرآن فى هذا البلد وفى غيره من البلاد، أى أن يكون مجتمعنا مجتمعا قرآنيا يعمل بالقوانين المدنية القرآنية . أما الدستور الهندي فيطالبنا بإنشاء مجتمع قائم على قانون الأحوال الشخصية الموحد . إن الدستور الهندي يجرنا فى اتجاه بينما القرآن يأخذنا فى اتجاه آخر مخالف تماما . وعلينا أن نقرر أي اتجاه سنختاره من الناحية الشرعية .

إن حياتنا الدينية تطالبنا بصورة واضحة بأن نوجه قافلتنا نحو الطريق القرآني . ولكى يصبح المسلمون مواطنى هذا البلد من الناحية الأيديولوجية فلا بد من إجراء بعض التعديلات الأساسية فى الدستور كى يتواءم مع المفاهيم القرآنية .

أما أن نغير شيئا من القرآن فهذا غير ممكن بالمرة . هذا هو إيماننا، وهذه هى عقيدتنا . فكل كلمة من كلمات القرآن غير قابلة للنسخ . أما الدستور فيمكن تعديله .. ومن باب الأسف أنه لم يجر أي حوار حول قضية أساسية كهذه خلال السنوات الخمسين الماضية .

إنه لا يجوز للأمة المسلمة أن تنحرف قيد أنملة عن البرنامج الفكري الذى وجدت من أجله . إن من عقيدتنا أنه لا يجوز ترك كرسي الخلافة خاليا لأكثر من ثلاثة أيام . إن الفقهاء مجمعون على أنه لا تقوم حياة المسلمين الملية والدينية والاجتماعية بدون الخلافة وبدون الإمام العادل .

إن من مصيبتنا أننا نعيش منذ ثلاث وسبعين سنة بدون خليفة وبدون أمير المؤمنين وأصبح هذا الأمر معتادا لنا لدرجة أننا لا نريد أن نفكر فى برنامج العمل الأساسي . إن من الواجب أن نسعى دوما لقيام الخلافة العالمية إلى أن يقوم نظام كهذا . وسيبقى إيماننا باقيا قائما فى هذه الحالة. ولكن الذى حدث من الناحية العملية يمثل فجوة عظيمة وهى أن هذا الحلم قد غاب عن الأمة خلال الخمسين السنة الماضية . لقد نسينا الهدف الذى جئنا من أجله إلى هذا البلد . ولم نعد نتساءل : ماذا كان علينا وماذا نقوم به؟ وما وضعنا فى هذا البلد ؟ وما الوضع الشرعي لهذا البلد ؟

اتصلوا بكبرى دور الإفتاء واسئلوها عما تقول الشريعة عن بلد كان "دار إسلام" فى وقت من الأوقات ثم أصيب بفاجعة فى مرحلة ما من مراحل التاريخ فما هى مسئولية المسلمين بعد انتهاء وضعه كدار إسلام ؟ إن الشريعة تأمرنا فى هذه الحالة بأن يستمر المسلمون فى سعيهم لتحويل بلد كهذا إلى دار الإسلام من جديد .

وفى وضع الهند الحالي لا مجال للقيل والقال عما إذا كنا فى العصر المكي أو المدني ؟! إنه بلد للمسلمين فيه تاريخ ألف سنة . إنه لا يمكنك أن تنفض يدك من التاريخ . يجب علينا أن نبحث عن حكم الشريعة فى هذه الورطة التى نجد أنفسنا فيها نتيجة حادثة من حوادث التاريخ وأن نبحث عن المخرج الذى تصفه الشريعة للخروج من هذه الورطة . إن أول عمل وبدون أي مماطلة هو أن يبدأ المسلمون جهودهم من جديد لإعادة هذا البلد دارَ إسلام كما كان فى سابق الزمان .

وهذا يتعلق بالوضع المحلى . أما على المستوى العالمي فعلى الأمة كلها أن تسعى لإرساء مؤسسة الخلافة مرة أخرى على أسسها. لم يحدث فى تاريخ الإسلام الممتد عبر ١٤٠٠ سنة أن ظلت مؤسسة الخلافة غائبة عنها لمثل هذه المدة الطويلة . إن على هذه الأمة التى تزعم أن تعدادها يبلغ بليونا ونصف بليون فى أنحاء العالم أن تسعى لإقامة مؤسسة الخلافة بغض النظر عن كونك رجلا أو إمرأة ، ولدا أو شيخا . إنه لا راحة لنا إلى أن تقوم مؤسسة (الخلافة) الرسالية .

إنه من جراء غياب الخلافة أن المسلمين أذلاء اليوم فى كل مكان فى أنحاء العالم .. فهناك من يذبحنا فى البوسنة وهناك من يطلق علينا النيران فى الشاشان .. وتجرى إبادتنا فى مختلف أنحاء العالم. هل لنا أن نشعر بالراحة فى مثل هذه الحالة ؟ أنا لا أظن أنه يجوز لنا أن نرتاح فى وضع كهذا. لا يكفينا أن نقول : إن الأوضاع سيئة.. إن الأوضاع ستزداد سوءا مالم نستعد لعلاجها الآن .

لا ينبغي أن يظن أحد أن إقامة الخلافة العالمية هى من مسئولية فرقة أو طبقة معينة . لقد دعونا كل طبقات الأمة، وقلنا لها: هذا عمل أساسي ولا يمكن أن يختلف فيه إثنان . ولهذا السبب علينا أن نستعين بكل شخص لإنجاز هذه المهمة . إن بابنا مفتوح لكل إمرء مسلم ولكل إمرأة مسلمة .

لقد وضع البرلمان الملي برنامجا للأخوات بصورة خاصة . لقد شعرنا أننا (٢٥٠) مليون شخص فى محيط يتكون من (١٠٠٠) مليون شخص .. ولو عطلت (١١٠) ملايين من النساء عن العمل فستنخفض قوتنا إلى النصف .

إن الله ورسوله يطالبان بمشاركة المرأة بصورة كاملة فى هذه الرسالة . فالقرآن يقول بصورة واضحة : "والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض" أى أنهم مساعدون ومعاونون – بعضهم للبعض – على عمل الخير والقضاء على الشر والباطل . وهذا من الضروري بمكان لأن قافلتنا لن تصل شاطئ النجاة بدون أن يتحرك نصف مجموعتنا .

إن الكفاح الناجح يتطلب أن نتخلص من بعض أفكارنا الرائجة عن النساء .. فعلى سبيل المثال : تقول أخواتنا عن مثل هذا الاجتماع: ما شأننا به ؟ أما الأخوات المتخرجات فى الجامعات العصرية فتظن أنه لا مكان لهن هنا، وأنه لو كان بإمكانهن أن يعملن شيئا فذلك فى مجال عرض الأزياء والاشتراك فى مهرجانات الموضة!

إننا نريد استعادة أخواتنا الضائعات .. ولا يمكننا أن نطالبهن من البداية بكيفية الحضور هنا بتحديد نوعية اللباس الذي يجب عليهن ارتداؤه وكيفية التقوى التى يجب عليهن التحلى بها من البداية .

إن الحقيقة هى أن قطاع المرأة قد تعرض للهدم تماما كما تعرض له قطاع الرجل . ولذلك فإن المطالبة المسبقة بشئ معين يعنى منعهن من الدخول إلى هذا المجال . لقد فتحنا هذا الباب لكنّ – أيتها الأخوات – لأننا نعتبركنّ أيضا أمينات على رسالة الله وتراث رسوله تماما كما نحن الرجال أمناء عليه، وأنتن مطالبات تماما كما الرجال مطالبون .

لعلكن تتذكرن أن رسول الله صلى الله عليه وسلم عندما انتهى من مخاطبة الرجال فى خطبة العيد ذات مرة توجه إلى النساء وناشدهن بالتبرع فى سبيل الله، فقامت صحابيات كثيرة بالتبرع بحليهن وأموالهن .

واليوم تحاصرنا حضارة غير إسلامية لدرجة أنه قد قضى على فكرة أن تتبرع أخواتنا من أموالهن لهذه الرسالة . إنهن محتاجات تماما للأزواج والإخوة . وحين يكون الزوج ضالا وحين يكون الزوج غافلا عن برنامج العمل الإسلامي

فإنه لا يكتفى بعدم البذل بل هو يمنع شيئا كهذا ويمنع من الذهاب إلى المسجد رغم أنه قد ورد بصورة واضحة فى الحديث النبوي بأن لا تمنعوا إماء الله من الذهاب إلى المساجد..

وأنتم تعرفون أن الخليفة عمر بن الخطاب كان له موقف شديد فى هذا الشأن استنبطه من الأحاديث النبوية التى تنصح النساء بأداء الصلاة فى زاوية من زوايا بيوتهن، فأصدر أمرا فى زمنه بأن تصلى النساء فى بيوتهن .. ولكن زوجته لم تقبل بهذا واستمرت فى الذهاب إلى المسجد . فقال الناس : ما هذا يا عمر ؟ إنك لا تستطيع أن تنفذ رأيك فى زوجتك ثم تقول لنساء الآخرين بأن يصلين فى بيوتهن ! فرد عمر قائلا : إن رسول الله قد قال بألا تمنعوا النساء من الذهاب إلى المساجد فماذا أستطيع أن أفعل ؟

وقد ورد عن عبد الله بن الزبير أنه قال لأبيه بشأن هذا الحديث: إنه يسلم بأن من حق المرأة أن تذهب إلى المساجد ولكنه لن يسمح بذلك بالليل نظرا للمخاطر، فوبّخه أبوه قائلا : ما هذه الجرأة منك! إن رسول الله يقول : (لا تمنعوهن) وأنت تقول : (لن أسمح لهن بالذهاب) فغضب منه أبوه ..

كيف يستطيع أحد أن يتجرأ على منع النساء من الذهاب إلى المساجد مهما ساءت الأحوال ومهما زادت الأخطار الخارجية ! هذا من الأفكار الأساسية التي تعرضت للخلط، وعلينا إقامتها من جديد على أسسها الحقيقية .

ولا يمكن لهذه الرسالة أن تحرز تقدما بدون مشاركة الأخوات . لقد رأينا حين بدأنا تحركا للذهاب إلى البوسنة أنه قام عدد كبير من الشباب بتسجيل أنفسهم . واندهشنا من أنه لا يزال هناك عدد كبير من الناس فى أمتنا ممن هم مستعدون للذهاب حتى إلى البوسنة لتأدية واجباتهم الإسلامية . ورأينا حين ذاك أن صراعا بدأ من قبل الأمهات والأخوات والزوجات اللواتي واجهنهم بالقول : هل حدث شئ لعقلك؟ وماذا يعنيك من هذا الذى يحدث فى البوسنة؟!

والحقيقة هى أننا لا نعرّف أمهاتنا وأخواتنا بهذه الأمور ولا نقوم بتعليمهن . إن عددا كبيرا من الأمهات والأخوات يعانين من الغفلة والجهل . والنتيجة هى أن قافلتنا الثورية لا تكاد تنطلق . خذ مثلا من مجتمع رسول الله صلى الله عليه وسلم .. فحين نزلت الآية القرآنية التى قالت : "من ذا الذى يقرض الله قرضا حسنا فيضاعفه له أضعافا كثيرة" تساءل أبو الدرداء : يا رسول الله ! هل الله تعالى يطلب القرض حقا ؟ فقال له رسول الله : نعم ! فقال أبو الدرداء : هات يدك! فأمسك بها وقال : إن أبا الدرداء يقرض ربه بستانه الذى به ٦٠٠ شجرة . ثم جاء أبوالدرداء إلى بستانه وهو يدرك أن ذلك البستان لم يعد ملكا له وينادى من خارج البستان : يا أم الدرداء أخرجي ! أخرجي ! لقد أقرضت هذا البستان لله ورسوله .. فتقول أم الدرداء : يا أبا الدرداء ! ما أحسن صفقتك .. وتخرج من البستان بكل سعادة مع أولادها . والسبب فى ذلك أنها كانت امرأة تستفيد باستمرار من مجالس الرسول صلى الله عليه وسلم حتى أصبحت جزءا من هذه الرسالة الثورية . إنها تدرك أن أبا الدرداء قد عقد صفقة عظيمة واشترى بها لنفسه مكانا معلوما فى الجنة .

إنه ما لم تشارك الأخوات فى هذه القافلة، وفى الحدود التى يسمح بها الإسلام، فسوف ينفرط عقد قافلتنا قبل المضى قدما .

وآخر الكلام أننا إن كنا مطمئنين حقا بأن هذا البرنامج القرآني هو البرنامج الذى يجب أن نعمل من أجله، فعلينا أن ندرك أن كل عمل فى عالم اليوم يتم بعد تخطيط كبير ثم ندرس نتائجه بعد خمس سنوات وعشر سنوات .

وإن كنا متفقين مع البرنامج الإسلامي الذى أصدرناه هنا نظريا وفكريا وإيمانيا فسوف ندرس فى الجلسات القادمة – التى هى جلسات مغلقة اليوم أو غدا – كيفية تنفيذه فى هذا البلد.. لنكن واضحين فكريا أننا لن نقبل لقيادة المسلمين سياسيا وفكريا وعمليا وفى أي مجال آخر إلا قيادة رسول الله.

سوف نتخذ موقفا فى هذا الشأن كما ورد فى "الميثاق الإسلامي" من أنه يجب إعادة تنظيم حياة المسلمين السياسية والدينية . وإن لم تكن هناك إمكانية لهذا فى إطار النظام السياسي القائم، فيجب علينا سلوك طريق جديد .. وإن كنا نرى أنه لا يمكن إعادة تنظيم حياتنا بدون حزب سياسي فعلينا اتخاذ الإجراءات الأساسية لإنشائه .

والشئ الآخر هو أنه يجب أن نكون واضحين أننا لن ننظم حياتنا القادمة إلا فى ضوء الشريعة . وإن كان هناك شئ حلال فهو حلال وإن كان هناك شئ حرام فهو حرام ولن نقبل بتغيير أي شئ من ذلك ولو جاء أكبر علماء العالم ليقنعنا بجوازه . ولن نعطى حق تحريم الحلال وتحليل الحرام لشخص ما وكتاب الله فى أيدينا . ولن نسمح لشخص ما بالتخفيف من أحكام الإسلام بما فيه الحكم القائل برفض العبودية السياسية للكفار والمشركين فى هذا البلد .

ينبغى ألا نرتكب اليوم أو غدا ما هو جريمة وذنب . وإن كنا مستعدين للمضى فى هذه القافلة بهذا الاستعداد الفكري فأنا على يقين بوعد الله بإنزال الملائكة للنصر الخاص . إن سورة الكهف لا تحوى (قصة) بل هى تحكى (واقعة) تتلخص فى أن بعض شباب الأمة الداعين إلى الله الواحد والمنادين بربوبيته واجهوا رفض المجتمع بل وخافوا على حياتهم فبسط الله عليهم مظلة الأمن ومرت قرون وهم آمنون في الغار وكانوا يتكونون من سبعة أشخاص وسخر الله لأمنهم أوضاعا خاصة . ثقوا من أنه لو تقدم البعض منا لإعلاء كلمة الله فلن يضيّعه الله . إن وعده هو المحافظة عليكم . فقد قال رسول الله: " يا أيها الناس إحفظوا اللهَ يحفظكم".

الأمة المسلمة فى هذا البلد معرضة فى كل لحظة لوضع لا يمكن التكهن به ولا أحد يدرى متى يُطفى قنديل حياته .. ولا تظننّ أن هذا الوضع خاص بالذين يريدون تغيير هذا النظام أو الذين ينتمون إلى بعض الجماعات أو إلى بعض الجهود أو بعض الأحزاب بل الخائفون من هذا الكفاح هم الآخرون معرضون إلى ضياع المال والروح بصورة كاملة .

إن هناك فهرسا كبيرا للاضطرابات الطائفية من بومباى إلى ميرُوت إلى سُورَت إلى مَلِيَانَهْ إلى هاشم بوره إلى بهاغلْ بور إلى مُرادآباد . وإن كان هذا البيت يُحرَق اليوم فقد يكون البيت المرشح للحرق غدا هو بيتى وبيتك . وإن قطعت الأيدي التى تقف ضد نظام الظلم اليوم فستزداد صعوبة وقوف أيدٍ أخرى غدا .

الذى أراه هو أنه يجب علينا قبل أن يقضى على أولى العزم من أمتنا وقبل أن تسجل فى حقهم مختلف بنود قانون الجنايات وقانون مكافحة الإرهاب، علينا أن نشعر بمسئوليتنا كأمة لكى لا يحدث أنه حين ترتفع عليك يد العدوان تكون يدك هى آخر يد للدفاع عنك ولا توجد أيدٍ أخرى للوقوف معك .

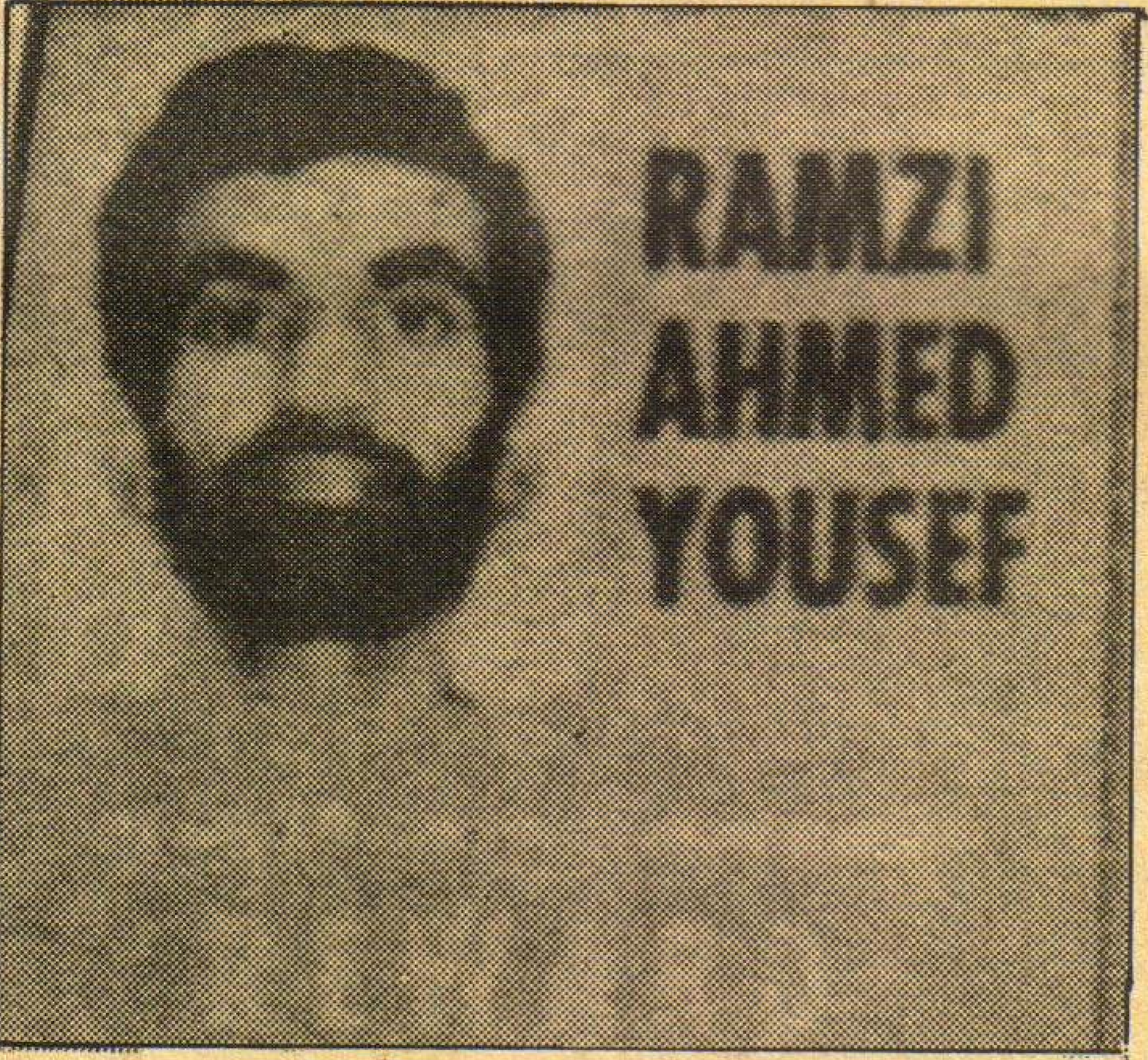
"مجھے فخر ہے کہ میں دہشت گرد ہوں"

امریکی عدالت میں رمزی یوسف کے جراتمندانہ اعلان کا ایک تجزیہ

رمزی یوسف جو گذشتہ چند برسوں سے امریکی حکام کے عتاب کا شکار ہے اور جنہیں دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے بالاخر امریکی عدالت نے ان کے لیے 240 سال قید کی سزا تجویز کی ہے۔ رمزی پر یہ الزام ہے کہ اس نے 1992 کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر بم دھماکہ میں حصہ لیا جس سے چھ لوگوں کی موت واقع ہوگئی تھی اور کوئی ایک ہزار سے زائد لوگ زخمی ہوگئے تھے۔ رمزی پہلے بھی یہ کہتے رہے ہیں کہ وہ موت سے نہیں ڈرتے، امریکیوں کی انھیں کچھ بھی پرواہ نہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ امریکیوں کے خلاف اسلحہ اٹھانا اور امریکی اداروں میں دہشت کا ماحول طاری کرنے کے لیے ان کے پاس اسلامی جواز موجود ہے۔ کوئی دو سال پہلے پریس کو جاری کردہ بیان میں رمزی نے واضح طور پر کہا تھا کہ امریکہ کی اسرائیلیوں کو غیر مشروط امداد نے یہ جواز فراہم کردیا ہے کہ اردن اور فلسطین کا ہر نوجوان امریکی ٹھکانوں پر حملہ کرے۔ رمزی کی دلیل یہ ہے کہ امریکہ نے براہ راست اسرائیل کے توسط سے فلسطینی عوام پر تادیب کا ماحول طاری کر رکھا ہے۔ امریکی پیسوں اور اسلحوں سے فلسطینی عوام کو کچلنے کا کام لیا جارہا ہے اور دنیا بھر میں اسلام دشمن قوتوں کو امریکہ اسلحے اور پیسے فراہم کررہا ہے۔ ایک ایسی قوت کے خلاف جو ہر لمحہ مسلم انقلابیوں کی خون کی پیاسی ہو، مسلم نوجوانوں کو کھل کر سامنے آجانا چاہیئے۔ رمزی کے اس پیغام سے کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے اتنی بات تو ضرور معلوم ہوتی ہے کہ امریکی اخبارات جس طرح رمزی کو ایک جنونی دہشت گرد باور کرانے پر تلے ہوئے ہیں در حقیقت ایسا نہیں ہے۔

عدالت میں جب رمزی کو 240 سال قید کی سزا سنائی گئی تو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا رمزی اس سزا کے لیے پہلے سے تیار ہو۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی اور چہرے پر غصے کے آثار تھے۔ جج کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے برملا کہا کہ مجھے فخر ہے کہ میں ایک ایسا دہشت گرد ہوں جس سے تمہاری حکومت کو خطرہ ہے۔ ہم نے جو کچھ کیا اس پر مجھے ذرہ برابر بھی تاسف نہیں۔ امریکی عدالت میں رمزی کا مقدمہ کئی برسوں سے زیر سماعت تھا۔ کسی بھی مرحلے میں رمزی نے کسی کمزوری کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ اس نے ہمیشہ یہی بات کہی کہ حق اس کے ساتھ ہے، وہ جائز حقوق کے لیے جدوجہد کررہا ہے۔ وہ ان مکاروں کے خلاف لڑرہا ہے جس نے پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کا خون ارزاں کر رکھا ہے، جس نے فلسطینیوں سے اس کی زمینیں چھین لی ہیں اور جو ہر لمحہ امت پر بے بسی کا عذاب جاری رکھنے کے لئے سرگرم ہے۔ رمزی کا کہنا یہ ہے کہ یہ سب کچھ دراصل عظیم جہاد ہے، اسے دہشت گردی نہیں کہا جاسکتا۔

چہرے بشرے سے ایک منحنی سا شخص دکھائی دینے والا رمزی یوسف انتہائی غیر معمولی ذہانت کا حامل ہے۔ جب اس نے نیویارک میں دھماکے کا پروگرام بنایا تو اس کی عمر اس وقت صرف 26 سال تھی۔ اسے اردو، عربی، پشتو، انگریزی اور فرانسیسی پر یکساں مہارت ہے۔ وہ ان زبانوں پر کچھ اس طرح قادر ہے کہ یہ پتہ لگانا دشوار ہوجاتا ہے کہ اس کی مادری زبان کون سی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دھماکے کے بعد بھی وہ کویت میں ایک فلسطینی باشندے کے طور پر نظر آیا تو کبھی عراقی پاسپورٹ پر سفر کرتا رہا۔ کبھی اسے پاکستانی سمجھا گیا تو کبھی اس نے خود کو یہودی عرب کی حیثیت سے پیش کیا۔ امریکی سراغ رساں ایجنسیاں حیران رہیں کہ آخر رمزی یوسف کہاں لاپتہ ہوگیا؟ کبھی وہ فلپین میں نظر آتا اور امریکی حکام حرکت میں آجاتے لیکن اگلے ہی لمحے یہ خبر ملتی کہ اسے پاکستان میں دیکھا گیا ہے۔ وہ تو کہیئے کہ اگر ایک لالچی مسلمان مخبر نے اسے دھوکا نہ دیا ہوتا تو امریکیوں کے لیے اس کو گرفتار کرلینا ممکن نہ ہوتا۔ اسے پاکستان میں ایک ہوٹل سے گرفتار کیا گیا اور تاریک رات میں ایک خصوصی طیارہ کے ذریعے امریکہ پہنچادیا گیا۔



پاکستان میں رمزی کی جس طرح گرفتاری عمل میں آئی اس سے پاکستان کی خود مختاری کے سلسلے میں بھی بعض اہم سوالات پیدا ہوگئے۔ بعض حلقوں کی طرف سے یہ پوچھا جانے لگا کہ اگر پاکستان امریکہ کے اشارے پر اس کے ایک ملزم کو گرفتار

کر کے دے سکتا ہے اور اسے بین الاقوامی طور پر برا نہیں سمجھا جاتا تو سلمان رشدی کو ایران کے حوالے کیوں نہیں کیا جاتا؟ تسلیمہ نسرین کو گرفتار کر کے بنگلہ دیش کیوں نہیں بھیجا جاتا جہاں عدالتوں میں ان کے خلاف مقدمہ درج ہے۔ رہی یہ بات کہ رمزی ایک دہشت گرد ہے تو یہ محض ایک مفروضہ ہے اس لئے کہ رمزی کے پاس امریکی ٹھکانوں پر حملہ کرنے کے لئے دلائل موجود ہیں۔ رمزی کی دہشت گردی دراصل مشرق وسطیٰ میں امریکی دہشت گردی کا ردعمل ہے۔ رمزی ہی نہیں بلکہ عرب دنیا کے بے شمار نوجوان امریکیوں سے سخت نفرت کرتے ہیں اور گذشتہ دو تین دہائیوں میں وہ لبنان، اردن، مصر اور اسرائیل میں امریکی ٹھکانوں پر حملے کرتے رہے ہیں۔ رمزی نے صرف اتنا ہی تو کیا کہ ایک قدم آگے بڑھ کر نیویارک میں دھماکہ کر آیا اسے دراصل امریکی حکام کو یہ احساس دلانا تھا کہ اگر تم ہماری زندگی جہنم گزار بنانے پر تلے رہے تو ہم تم سے تمہارے شہروں میں جاکر انتقام لیں گے۔ تمہارا حفاظتی نظام کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو تم ہماری دسترس سے باہر نہیں ہو۔

وہ بلا کا ذہین ہے اس کے پاس الیکٹرونکس میں انجینئرنگ کی ڈگری موجود ہے۔ وہ مختلف زبانوں پر قادر ہے اگر وہ چاہتا تو اپنے لئے ایک پرسکون اور پر تعیش زندگی منتخب کر سکتا تھا لیکن اس نے سکون کی زندگی کو چھوڑ کر ایک خطرناک راستے کا انتخاب کیا۔ جو شخص اسلام کے غلبے کے لئے اپنے سکون کو تج دے، پرسکون گھر کو خیرباد کہہ کر عمر بھر قید کی زندگی کو اپنے لئے پسند کرلے یقیناً وہ کوئی عام شخص نہیں بلکہ امت کی امیدوں کا مرکز ہے۔

رمزی کا خیال تھا کہ امریکیوں کو جب تک اپنی اصل اوقات کا اندازہ نہ دلایا جائے ان کے دماغ ٹھکانے نہیں آئیں گے۔

رمزی نے اپنے حصے کا کام کر دکھایا ہے۔ اسے اس بات کی کچھ بھی پرواہ نہیں کہ دنیا اسے دہشت گرد قرار دے یا اس کا نام تاریخ کی کتابوں میں انقلابی کی حیثیت سے لکھا جائے۔ اس نے جو کچھ کیا اسے اس پر اطمینان ہے اور وہ خوشی خوشی عمر قید کی سزا جھیلنے کے لیے تیار ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس نے اپنے عمل سے ایک تاریخ بنائی ہے۔ کمزوروں کو جابروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا سلیقہ سکھایا ہے البتہ رمزی کی گرفتاری سے لے کر سزائے موت تک کے واقعے کو پوری امت نے جس طرح ٹھنڈے پیٹوں برداشت کیا ہے اور جس طرح اس پورے قضیے سے امت اپنے آپ کو لاتعلق محسوس کرتی رہی ہے۔ اس سے رمزی کو یقیناً مایوسی ہوئی ہوگی۔ چند ایک تحریکوں اور شخصیات کو چھوڑ کر رمزی کی حمایت میں عمومی طور پر کوئی آواز نہیں اٹھی۔ دنیا اسے دہشت گرد باور کراتی رہی اور ہم اسے ایسا ہی سمجھتے رہے۔ حالانکہ ہمیں خوب معلوم تھا کہ رمزی کوئی عام دہشت گرد نہیں بلکہ ایک صالح انقلاب کا علمبردار ہے۔ ہم رمزی کے اس اقدام سے اتفاق کریں یا اختلاف، اتنی بات تو ہمیں تسلیم کرنی ہوگی کہ رمزی نے جو کچھ کیا وہ اپنی ذات کے لیے نہیں تھا۔ وہ بلا کا ذہین ہے اس کے پاس الیکٹرونکس میں انجینئرنگ کی ڈگری موجود ہے۔ وہ مختلف زبانوں پر قادر ہے اگر وہ چاہتا تو اپنے لئے ایک پرسکون اور پر تعیش زندگی منتخب کر سکتا تھا لیکن اس نے سکون کی زندگی کو چھوڑ کر ایک خطرناک راستے کا انتخاب کیا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ اگر لوگ اپنے انفرادی سکون اور چین کی زندگی کے عادی ہو گئے اور اگر ہر شخص نے صرف اپنی ذات تک خود کو محدود کر لیا تو اس امت پر جاری زوال کا مداوا نہ ہو سکے گا۔ رمزی کے قدم سے کسی کو اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن اختلاف کے باوجود ہر مسلمان کے دل میں اس کے لئے عقیدت و احترام کا جذبہ موجود ہو گا اس لئے کہ جو شخص اسلام کے غلبے کے لئے اپنے سکون کو تج دے، پرسکون گھر کو خیرباد کہہ کر عمر بھر قید کی زندگی کو اپنے لئے پسند کر لے یقیناً وہ کوئی عام شخص نہیں بلکہ امت کی امیدوں کا مرکز ہے۔ جو لوگ غلبہ اسلام کی آرزو لیے جیتے اور مرتے ہیں وہ رمزی کے غم کو باسانی برداشت نہیں کر پائیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ امت اپنے محسنوں کو پہچانے۔ ان کی آواز میں آواز ملائے اور ان کی قربانیوں کو یاد رکھے کہ اللہ کے نزدیک جو لوگ راہ حق میں سبقت لے گئے وہ رمزی یوسف جیسے لوگ ہیں خواہ دنیا انھیں دہشت گرد قرار دے یا انھیں جنونی تنگ نظر ملا باور کرایا جائے۔

فیصلے کے مطابق رمزی یوسف کو اب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قید تنہائی میں رہنا ہوگا۔ اس کے وکیل کے علاوہ کسی اور کو اس سے ملنے کی اجازت بھی نہ ہوگی گویا امریکی رمزی یوسف کو انقلابی مسلمانوں کے لئے ایک سامان عبرت بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں البتہ رمزی نے بھری عدالت میں اپنی ثابت قدمی سے مغربی مبصرین کے اندازے غلط ثابت کر دیے ہیں۔ وہ عمر بھر امریکی جیل میں سڑنے کے لئے تو آمادہ ہے لیکن اپنے موقف میں ذرا بھی لچک پیدا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اسے احساس ہے کہ اس نے ذرا بھی کمزوری دکھائی تو اس جیسے بے شمار نوجوانوں کے حوصلے ٹوٹ جائیں گے۔ ایک طرف رمزی کو تو عام مسلمانوں کے حوالے کی اتنی فکر ہے لیکن افسوس کہ عام مسلمانوں کی طرف سے رمزی کے حق میں حمایت کی آواز بھی نہیں اٹھی ہے۔ رمزی ہوں یا امریکی جیل میں مقید شیخ عمر عبدالرحمن یا ان جیسے بے شمار فدائین اسلام، یہ سب کے سب امت کے مستقبل کے امین ہیں۔ امت نے اگر ان محسنوں سے لاتعلقی کا اظہار کیا تو پھر ہمارے درمیان باحوصلہ آوازوں کا اٹھنا مشکل ہو جائے گا۔ □

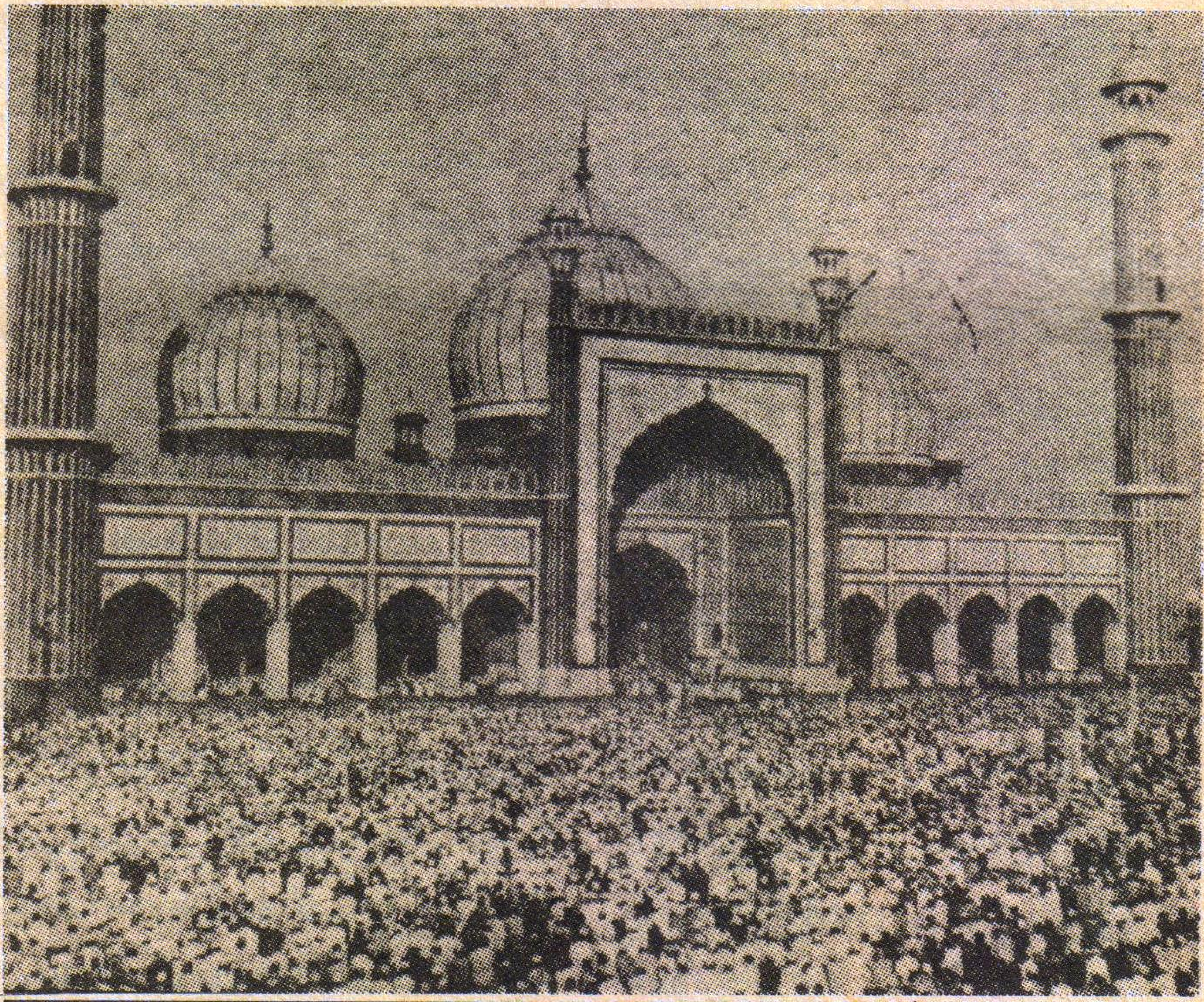
ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی قافلہ اب متحرک ہونے کو ہے

دردمندان امت کے نام قائد ملی پارلیامنٹ ڈاکٹر راشد شاذ کے ایک اہم مکتوب کا متن

برادران گرامی اور دختران ملت

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الکشن کا ہنگامہ اب ختم ہونے کو ہے۔ سیاسی پارٹیاں تھکا دینے والی سیاسی مہموں کے بعد اب مستقبل کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ ہر کسی کو خوشگوار صبح کی آمد کا انتظار ہے۔ جس نے جتنی محنت کی ہے اسی قدر بہتر مستقبل کی آس لگائے بیٹھا ہے۔ ایک ایسے لمحے میں ملک کے پچیس کروڑ ہندوستانی مسلمان خود کو ایک عجیب صورت حال سے دوچار پاتے ہیں۔ غمناک نگاہیں ملک میں ہورہی سیاسی تبدیلی کی طرف اٹھتی ہیں اور اپنے لئے مستقبل کے دروازے بند پاکر مایوسی سے لوٹ جاتی ہیں۔ آج جب ملک کی دوسری قومیں الکشن میں اپنی محنتوں کا پھل کاٹ رہی ہیں اور اس کی بنیاد پر قوت کے نئے میزانیے میں زیادہ موثر رول ادا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے الکشن میں ان کا متحرک رہنا پولنگ بوتھ تک جوش و خروش سے جانا اور اپنی پسند کے امیدوار کو کامیاب بنانے کے لئے سردھڑ کی بازی لگادینا دراصل یہ سب کچھ ایک سراب تھا کہ اب وہ نئی سیاسی صورت حال میں ذرہ برابر بھی اہمیت نہیں رکھتے۔



☆ سرزمین دلی کی مسجود دل غمدیدہ ہے
ذرے ذرے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے

اس وقت ہندوستانی مسلمانوں پر وہی کیفیت طاری ہے جو خواب سے اچانک بیدار ہوجانے والے شخص پر ہوتی ہے۔ وہ اپنی آنکھیں ملتا ہے اور اپنے اردگرد خواہشات سے مختلف ایک نئی دنیا پاکر حقیقت سے آنکھیں بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے اے کاش کہ خوابوں کی دنیا ہی سچی ہوتی یا کم ازکم اس میں واپس لوٹ جانے کی کوئی ترکیب اسے ہاتھ آجاتی۔ الکشن سے پہلے جو لوگ آپ کی ہمدردی کا دم بھرتے تھے اور جنھیں آپ کے ووٹوں کی ضرورت تھی اور جو آپ کے کمزور کندھوں پر اپنی جاہ و حشمت کا جلوس نکالتے تھے وہ سب کے سب اب آپ کے مسائل سے بے خبر اپنے سیاسی مستقبل کو تابناک بنانے کی فکر میں ہیں۔ اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کو اس وقت یہ محسوس ہورہا ہے کہ آنے والے دنوں میں اونٹ جس کروٹ بھی بیٹھے اور سیاسی دسترخوان پر جسے جتنا کچھ بھی مل جائے البتہ ان کے ہاتھ کچھ بھی لگنے والا نہیں۔

قرائن بتاتے ہیں کہ نئی حکومت میں بھارتیہ جنتا پارٹی کو بڑی حد تک سبقت حاصل ہوجائے گی اور یہ صورت حال مسلمانوں میں مزید مایوسی کو جنم دے گی اس لئے کہ انھوں نے اپنے آپ کو جن سیاسی پارٹیوں سے وابستہ کر رکھا ہے یا جن غیر مسلم سیاسی رہنماؤں کو مسیحائی کے مقام پر فائز کر رکھا ہے انھیں اس سیاسی اکھاڑے میں متوقع کامیابی نہیں مل پائے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جو لوگ اپنی قسمتوں کا محافظ لالو یادو یا ملائم سنگھ کو سمجھ بیٹھے ہیں یا جن کو

اپنی حفاظت کی امید کانگریس کے سایہ عاطفیت میں نظر آتی ہے ان کے اوپر سخت مایوسی طاری ہوجائے گی۔ ہندوستانی مسلمانوں نے جن جھوٹے خداؤں پر تکیہ کیا تھا یا جن سیاسی آقاؤں سے اپنے مستقبل کو وابستہ سمجھا تھا، قوت کی جنگ میں ان آقاؤں کے پیچھے رہ جانے سے ان کے حواریوں پر مایوسی کی کیفیت پیدا ہونا فطری ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری امت ہندو احیاء پرستوں کی طرف فدویانہ اور ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھے گی اور اس کے قائدین اس بات کی کوشش کریں گے کہ منت سماجت کے ذریعے نئی سیاسی قوت سے ہی زندگی جینے کی مزید مہلت مانگ لی جائے۔ جو لوگ کانگریسی نظام کفر کے اندر خوشگوار زندگی جینے کا طویل تجربہ رکھتے ہیں اور جنہیں مسلم دشمن کانگریس سے رشتہ الفت و محبت قائم رکھنے میں مہارت حاصل رہی ہے ان کے لئے ہندتو کے دربار سے راہ و رسم پیدا کرنا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ اس طرح بہت جلد آنے والے دنوں میں کانگریسی اور جنتادلی مسلمانوں کی طرح بھاجپائی مسلمانوں کی بھی ایک نسل وجود میں آجائے گی۔ مسلمانوں میں جو لوگ ماخذ اقتدار سے فائدہ کشید کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں ان کے لئے اس صورت حال سے کوئی فرق واقع نہ ہوگا اس لئے کہ ان حضرات کے لئے اپنا سیاسی قبلہ تبدیل کرنا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ رہے عام مسلمان تو ان کے اندر نئی صورت حال ایک شکست خوردہ مایوسی کو جنم دے گی۔

انصاف کے نعرے کے ساتھ میدان میں آئیں۔ عافیت کے متلاشی مسلمان ان پارٹیوں کے دست و بازو بن گئے لیکن یہاں بھی انھیں صرف استعمال کیا گیا۔ ان پارٹیوں کے قائدین کی تربیت بھی چونکہ کانگریس کلچر میں ہوئی تھی اس لئے مسلمانوں کو سبز باغ دکھانے میں انہیں بھی مہارت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حالیہ الکشن میں یونائٹڈ فرنٹ کی پارٹیوں کے لئے بھی مسلمانوں کے جوش و خروش میں خاصی کمی آئی ہے۔

بے چارہ مسلمان کرے تو کیا کرے؟ وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مسلم دوستی کی دعویدار تمام پارٹیاں نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں بلکہ وہ کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں جس سے اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل پر روک لگانا ممکن ہو۔ گویا اس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ موجودہ ہندوستان کی تمام غیر مسلم پارٹیاں اسلام اور مسلمانوں کے لئے مخلص نہیں ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان کرے تو کیا کرے؟

عام مسلمان جب جبہ و دستار والے قائدین کی طرف دیکھتا ہے اسے یہ توقع ہوتی ہے کہ شاید دین و شریعت کا علم رکھنے والے لوگ اس مسئلے میں ان کی کوئی صحیح رہنمائی کریں گے لیکن اسے یہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوتی ہے کہ ہماری مذہبی اور دینی قیادت بھی کفار کے مختلف خیموں میں بٹ چکی ہے۔

> اس وقت ہندوستانی مسلمانوں پر وہی کیفیت طاری ہے جو خواب سے اچانک بیدار ہوجانے والے شخص پر ہوتی ہے۔ وہ اپنی آنکھیں ملتا ہے اور اپنے اردگرد خواہشات سے مختلف ایک نئی دنیا پاکر حقیقت سے آنکھیں بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

نئے ہندوستان میں مسلمانوں کو پہلے سے کہیں زیادہ یہ محسوس ہوگا کہ وہ جس سیاسی راستے پر اب تک چلتے رہے ہیں وہ دراصل اغیار کا بنایا ہوا راستہ ہے جس پر چل کر وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ ان کے اندر یہ احساس شدت اختیار کرتا جائے گا کہ سیکولر سیاست کے نام پر دراصل مختلف سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کو غیر اسلامی ایجنڈے کے فروغ کے لئے استعمال کرتی رہی ہیں کہ مسلمان کوئی نصف صدی تک کانگریس کی غیر مشروط اطاعت پر مامور رہے۔ انھوں نے اپنے سیاسی ایجنڈے کو ترک کردیا۔ اس ملک کو دوبارہ دارالاسلام بنانے کے خواب کو لپیٹ کر رکھ دیا۔ عافیت کی زندگی کی تلاش میں رسول اکرم کے سیاسی ایجنڈے کو منجمد کردیا۔ ملی اور مذہبی بنیادوں پر اپنی سیاسی صف بندی سے برات کا اعلان کیا اور علی الاعلان من حیث الامت اسلامی ایجنڈے سے کنارہ کش ہوکر سیکولرزم کے علمبردار اور مبلغ بننے سے باز نہ آئے۔ رسول سے جو رشتہ ٹوٹا سو ٹوٹا، خود دنیا میں بھی انھیں کیا ملا؟ کانگریس کی طویل دور حکمرانی کا ہر دن قیامت انگیز ثابت ہوا۔ دریں اثناء ملک میں قوت کے نئے مراکز وجود میں آنے لگے۔ علاقائی پارٹیوں نے اہمیت اختیار کرلی۔ دلتوں، یادووں اور مختلف قومیت کی نمائندگی کرنے والی چھوٹی چھوٹی پارٹیاں سماجی

کہنے کو تو یہ سب نائبین رسول ہیں اور نظری اعتبار سے ان میں سے ہر ایک کو رسول اللہ کی قیادت پر کامل اعتماد ہے لیکن عملی طور پر ان میں سے بیشتر نے کسی نہ کسی غیر مسلم سیاسی قیادت کے ہاتھوں پر بیعت کر رکھی ہے۔ گویا کفر کا ایجنڈا ڈھونے میں یہ عام مسلمانوں سے کہیں آگے نظر آتے ہیں۔ ہر الکشن کے موقع پر ان کے جوڑ گھٹاؤ اور غور و فکر کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ ان کی پسند کی غیر اسلامی ایجنڈا رکھنے والی سیاسی پارٹی کو ووٹ دے دیا جائے۔ اس پورے تماشے میں ان قائدین کا شاید کچھ بھلا ہوجاتا ہو البتہ امت پر سیاسی بے بسی کی رات مزید طویل ہوتی جاتی ہے۔

سابقہ انتخابات کی طرح اس بار بھی سیاسی مسئلہ پر مسلمانوں کے یہاں مشاورتیں منعقد ہوئیں۔ مذہبی لوگ سیاسی مسئلے پر سر جوڑ کر بیٹھے۔ کمیٹیاں بنائی گئیں تاکہ مسلمانوں کی رہنمائی کی جاسکے لیکن ذرا اندرون میں جاکر دیکھئے تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے بیشتر کوششیں دراصل سیاسی پارٹیوں کے ایماء پر ان کے لئے زمین ہموار کرنے کے لئے کی جارہی تھیں۔ یقیناً ان میں بعض مخلص مسلمان بھی تھے جو محض امت کے مستقبل کے سلسلے میں فکر مند تھے اور وہ اپنی بساط بھر فاشزم کے مقابلے کے لئے کچھ کرنا چاہتے تھے البتہ ان سبھوں کا پیش کردہ حل ایک تھا اور وہ یہ کہ مسلمان سیکولر پارٹیوں کی تھیلی میں اپنا ووٹ ڈال دیں اور اس ملک کے امور کو

ان کے ہاتھوں میں سونپ کر خود چین کی نیند سوئیں۔

غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے لئے فضا ہموار کرنے والے لوگ خواہ کرائے کے مسلمان ہوں یا موسمی مولوی یا مخلصین امت، یہ سب کے سب یکساں طور پر اس جرم میں برابر کے شریک ہیں کہ وہ اس ملک میں مسلمانوں کو ایک ایسے سیاسی راستے پر چلائے رکھنا چاہتے ہیں جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن برملا اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ کفار مسلمانوں کے امور کے نگراں نہیں بنائے جاسکتے۔ دنیا کے کسی حصے میں اور تاریخ کے کسی لمحے میں امت مسلمہ کی سیاسی، سماجی یا روحانی قیادت پر غیر مسلموں کو فائز نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اس بات سے بھی خوب واقف ہیں کہ ووٹ ایک امانت ہے جسے مسلمان کی حیثیت سے ہم کسی ایسی پارٹی کے حوالے نہیں کرسکتے جو اسلام کے علاوہ کوئی اور ایجنڈا رکھتی ہو۔ رہیں موجودہ سیکولر پارٹیاں اور سیاسی قائدین جن کی اسلام دشمنی ہر خاص و عام پر واضح ہے تو ایسی کسی پارٹی کو برضا و رغبت اقتدار سونپنا یا اسے اقتدار میں لانے کے لئے جدوجہد کرنا نہ صرف یہ کہ شرعی احکام کی پامالی ہے بلکہ عقل سلیم کے بھی خلاف ہے۔ جو لوگ علی الاعلان الٰہی ہدایت کے منکر ہوں، جن کے لئے رسول اکرم کی شریعت قابل قبول نہ ہو وہ بھلا رسول کی امت کے تئیں مخلص کیوں کر ہوسکتے ہیں؟



آپ نے جن سیاسی پارٹیوں پر تکیہ کیا تھا اور جسے اپنے تحفظ کی ذمہ داری سونپی تھی، نئے سیاسی منظرنامے میں ان کی فیصلہ کن حیثیت ختم ہوجانے کا وافر امکان ہے گویا آپ کے مہرے پٹ چکے ہیں۔ سیاسی بساط پر آپ کے حصے میں شکست آئی ہے لیکن یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا۔ آپ نے جن جھوٹے خداؤں سے اپنی قسمت وابستہ کی تھی ان کی قوت کو ایک نہ ایک دن گھن لگنا تھا۔ رب ذوالجلال کو چھوڑ کر واقعہ یہ ہے ان جھوٹے خداؤں سے لو لگانا ایک بڑی سنگین غلطی تھی لیکن اس صورت حال سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ چلئے اچھا ہوا آپ جھوٹے محافظوں کی حفاظت کے فریب سے نکل آئے۔ اب یہ نئی صورت حال ہے جس میں آپ کو اپنے تحفظ کی فکر خود کرنی ہے۔ مستقبل کے لئے منصوبہ خود ترتیب دینا ہے اور اپنی بنیادوں پر اس ملک میں زندگی جینے کی منصوبہ بندی کرنی ہے۔ اگر نئی صورت حال کا چیلنج قبول کرنے کا داعیہ آپ کے اندر پیدا ہوجائے تو یہ ایک بہت بڑی نعمت ہوگی ورنہ اگر دوبارہ حفاظت کی تلاش میں آپ جھوٹے خداؤں کے بوسیدہ سیاسی خیموں میں چھپتے پھرے تو کہیں پناہ نہ مل سکے گی۔

آپ کی نگاہوں سے یہ بات بھی اوجھل نہ ہو کہ آج آپ کو جس صورت حال کا سامنا ہے اس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایک مسلم دشمن قوت دہلی میں اقتدار سنبھالنے کی تیاری میں مصروف ہے لیکن کچھ یہی صورت حال تو اس ملک میں گذشتہ پچاس برسوں سے قائم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلی بار آپ کے دل و دماغ پر دشمن کی مسلم دشمنی واضح ہوئی ہے اور آپ حکمرانوں کی اسلام دشمنی کا کسی قدر ادراک کرپائے ہیں۔ ہمارے خیال میں موجودہ صورت حال پچھلی تمام صورت حال سے بہتر ہے کہ یہاں آپ کو حکمرانوں کی دشمنی کا ادراک ہے اور آپ کے اردگرد سے تحفظ کا جھوٹا وعدہ کرنے والی پارٹیاں غائب ہوچکی ہیں یا کم از کم ان میں اتنا کس بل نہیں رہ گیا ہے کہ آپ ان سے اپنی حفاظت کی توقع کریں گویا ایک نظام جبر ہے جس میں آپ کو اپنے لئے راستہ بنانا ہے۔ بالفاظ دیگر آپ پہلی بار حقیقت کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کے قابل ہوئے ہیں اور آپ کے اندر یہ احساس بھی پیدا ہورہا ہے کہ صورت حال کی درستگی کے لئے آپ کو جو کچھ بھی کرنا ہے وہ صرف اپنے بل بوتے پر۔ گویا پچاس سال کے عرصے میں پہلی بار اسلامیان ہند کا قافلہ اب متحرک ہونے کے لئے پر تول رہا ہے۔

مسلمانوں کے لئے موجودہ صورت حال میں مایوس ہونے یا خوف کھانے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جو لوگ جھوٹے محافظوں کے سہارے اس ملک میں زندگی جیتے تھے انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان محافظوں نے اسلام اور مسلمان کی حمایت میں زبانی جمع خرچ کے علاوہ کچھ نہیں کیا البتہ جو لوگ اپنے لئے اللہ کی حفاظت کو کافی سمجھتے ہیں تو انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی قوت کو کبھی زوال نہیں اور اللہ تعالیٰ آخری رسول کی امت کو بے سہارا نہیں چھوڑے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان صورت حال کا سچا ادراک کرے، ماضی کی غلطیوں سے اپنا دامن بچائے

اور آنے والے دنوں کی لئے ایک جرات مندانہ منصوبہ ترتیب دے۔ اپنی حفاظت کا کام اور اس ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کا منصوبہ اغیار کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بجائے اسے اپنی قوت کے مطابق بروئے کار لانے کی کوشش کرے ۔گویا ماضی کی سیاسی بے اعتدالیوں کو یکسر خیرباد کہہ کر ایک نئے رویے کے داغ و بیل کا وقت اب ہمارے دروں پر آپہنچا ہے۔ہم لاکھ چاہیں اب اس ایجنڈے کو مزید مؤخر کرنا ممکن نہیں۔

ہم نے پہلے بھی یہ بات کہی تھی کہ اس ملک میں مسلمانوں کو سیاسی ارتداد سے بچانے کے لئے ایک مسلم سیاسی پارٹی کا قیام ضروری ہے۔ہم اس صورت حال کو صحیح نہیں سمجھتے کہ جس ملک میں مختلف سیاسی گروہوں اور مذہبی جماعتوں کو سیاسی صف بندی کی اجازت حاصل ہو اور جہاں وہ اس سے کماحقہ فائدہ بھی اٹھارہی ہوں وہاں مسلمانوں کا سیاسی شیرازہ منتشر رہے ۔ ملک کے ہر نظری گروہ کے پاس تو ایک سیاسی ایجنڈا موجود ہو لیکن مسلمان ایک واضح سیاسی ایجنڈے کی موجودگی کے باوجود دوسری سیاسی پارٹیوں کے ایجنڈے کو آگے بڑھانے کے لئے خود کو مجبور پائیں ۔ہم اس صورت حال کو سیاسی ارتداد سے تعبیر کرتے ہیں۔ہمارے نزدیک یہ صورت حال خدا اور اس کے رسول سے بغاوت کے مترادف ہے۔ہم اسے ایک لمحے کے لئے بھی برداشت کرنا گناہ عظیم تصور کرتے ہیں۔

بعض لوگوں کو مسلمانوں کی سیاسی صف بندی ایک ناقابل عمل خیال معلوم ہوتا ہے ۔وہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں جہاں مسلمان تھوڑے اور منتشر ہیں، کسی مسلم سیاسی پارٹی کی کامیابی کے امکانات بہت معدوم ہیں۔ اولاً یہ بات عقلی طور پر صحیح نہیں اس لئے کہ اسی ملک میں چھوٹی چھوٹی مذہبی اکائیاں سیاسی صف بندی کے ذریعے ملک کی سیاست پر اثرانداز ہورہی ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ نئے سیاسی میزانیے میں مسلمانوں کی سیاسی صف بندی ان کے لئے بہتر حالات پیدا نہ کرے ۔ یہ وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جو سیاسی کھیل کے آداب سے قطعی ناواقف ہوں بفرض محال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ایک مسلم سیاسی پارٹی مسلمانوں کو بہت کچھ دینے میں کامیاب نہیں ہوسکے گی جب بھی اس ایجنڈے کو مؤخر کئے دینا مناسب نہیں ہے اس لئے کہ ایک نئی سیاسی پارٹی کے قیام سے مسلمانوں پر صرف اقتدار کے دروازے کھلنے کے امکانات پیدا نہیں ہوتے بلکہ مختلف سیاسی پارٹیوں کے ایجنڈے کو ترک کرکے انہیں ایک اسلامی سیاسی ایجنڈے کے لئے متحرک ہونے کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔

اب یہ سوال سیاسی پارٹی کے قائدین پر منحصر ہے کہ وہ مسلمانوں کی سیاسی صف بندی کے ذریعے مستقبل کے اسلامی انقلاب کا راستہ کس طرح ہموار کرتے ہیں۔ سیاسی پارٹی کا قیام فی نفسہ ہمارا ہدف نہیں ہوسکتا۔ البتہ اگر اس ملک میں اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے کسی ایسی پارٹی کے قیام سے کوئی مدد ملتی ہو تو بلاتاخیر اس کے قیام کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہمارے خیال میں ملک میں ایک نئی مسلم سیاسی پارٹی کے قیام سے بہت سے فائدے حاصل ہوں گے۔ اولاً سیاسی سطح پر امت کے اندر جو انتشار پایا جاتا ہے اس کا خاتمہ ہوگا۔ اندھی گلی میں پھنس جانے کا احساس ختم ہوگا اور مستقبل کی ترتیب و تنظیم کے لئے ایک واضح راستہ ہاتھ آجائے گا۔ ثانیاً مسلمانوں کو یہ معلوم ہوسکے گا کہ ان کے پاس ایک واضح سیاسی ایجنڈا موجود ہے جس سے صرف ان کی دنیا نہیں بنتی بلکہ آخرت میں بھی کامیابی کی ضمانت ملتی ہے۔ مسلمانوں میں اگر یہ احساس عام ہوگیا تو ہمارے منجمد ملی قافلے میں حرکت آجائے گی۔ ثالثاً غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ حسب سابق مسلمانوں کا سیاسی استحصال کرتے رہیں یا بے شعور مسلمانوں کی جدوجہد کی بنیاد پر اپنے سیاسی عزائم کی تسکین کا سامان کریں۔ رابعاً ملک کے عام باشندوں میں یہ احساس ختم ہوگا کہ مسلمان ایک بے سمت گروہ کا نام ہے، ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہندوستانی معاشرہ عدل و انصاف کے اسلامی سیاسی ایجنڈے میں دلچسپی محسوس کرے گا جس سے ممکن ہے آنے والے دنوں میں اسلام کی طرف واپسی کی عمومی صورت حال پیدا ہو۔

جس طرح پچاس سال کے عرصے میں شریعت کے نام سے مسلمانوں کے ذہنوں میں نکاہ و طلاق اور وراثت کے مسائل آتے ہیں اور یہ عمومی تصور ختم ہوچکا ہے کہ اسلام کامل اجتماعی زندگی میں شرعی احکامات کی پیروی کا طالب ہے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ یہ تصور بھی ختم ہوجائے گا کہ مسلمانوں کے پاس کوئی اسلامی سیاسی ایجنڈا موجود ہے جس کا نفاذ ان کی مذہبی ذمہ داری ہے۔

اس کے برعکس اگر مسلمان موجودہ سیاسی رویے پر گامزن رہے تو رفتہ رفتہ اپنی ملی اور مذہبی شناخت بھی کھودیں گے۔ جس طرح پچاس سال کے عرصے میں شریعت کے نام سے مسلمانوں کے ذہنوں میں نکاح و طلاق اور وراثت کے مسائل آتے ہیں اور یہ عمومی تصور ختم ہوچکا ہے کہ اسلام کامل اجتماعی زندگی میں شرعی احکامات کی پیروی کا طالب ہے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ یہ تصور بھی ختم ہوجائے گا کہ مسلمانوں کے پاس کوئی اسلامی سیاسی ایجنڈا موجود ہے جس کا نفاذ ان کی مذہبی ذمہ داری ہے۔ اگر صورت حال کو اسی رخ پر چھوڑ دیا گیا اور مسلمانوں کی سیاسی صف بندی نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ سیاسی اور معاشی ارتداد کے بعد مذہبی ارتداد کا سلسلہ شروع ہوجائے اس لئے کہ جو شخص دین کے ایک حصے سے غافل ہوگیا اور جس نے زندگی کے ایک گوشے میں اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کی اس کے لئے

دوسرے گوشوں میں بغاوت کی راہ پر چل نکلنا آسان ہوجاتا ہے۔ صرف زبان پر کلمہ جاری ہو اور عملی زندگی کفر کی اتباع میں لت پت ہو تو اس طرح کسی کو زیادہ دنوں تک مسلمان بناکر نہیں رکھا جاسکتا۔ بد قسمتی سے ہندوستانی مسلمانوں میں غیر اسلامی سیاسی کلچر نے کچھ اس طرح اپنے پنجے جمائے ہیں کہ ان کا نظری سرمایہ اور ان کے اندر ایک انقلابی امت کا احساس بڑی تیزی سے تحلیل ہوتا جارہا ہے۔ یہ ایک انتہائی خطرناک صورت ہے۔ اس کے سد باب کے لئے ضروری ہے کہ اسلامیان ہند کے قافلے کو ایک کامل اسلامی ایجنڈے کے تحت متحرک کردیا جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس عظیم مقصد کے لئے بلاتاخیر مسلمانوں کی صف بندی کا کام شروع کردیا جائے۔ نئی مسلم سیاسی پارٹی دراصل اسی طرف ایک قدم ہوگی۔

مسلم سیاسی پارٹی کے قیام کے فیصلے سے اور کچھ ہو یا نہ ہو اتنا تو ضرور ہوگا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی قبلہ درست ہوجائے گا۔ جو لوگ اب تک مختلف پارٹیوں میں نام نہاد سیکولرزم اور ڈیموکریسی کے استحکام کے لئے سرگرم تھے انہیں یہ معلوم ہوجائے گا کہ ان اجنبی خیالات کی ترویج و اشاعت کے بجائے ہمارے لیے کرنے کا کام اسلامی نظام عدل کا قیام ہے۔ اب اس مقصد کے لئے ہمیں خواہ کوئی بھی ترکیب اختیار کرنی پڑے، خواہ اس کے لئے الکشن کا راستہ اختیار کرنا پڑے یا سیاسی عمل سے دور رہنا مفید ہو، البتہ ہر حال میں اسی مقصد کو آگے بڑھانے کی فکر کرنی ہے۔ اگر نئی سیاسی پارٹی صرف اس فکر کو مسلمانوں میں عام کرنے میں کامیاب ہوگئی تو ہم سمجھیں گے کہ انقلاب اسلامی کا خوابیدہ کارواں حرکت میں آگیا ہے اور اگر ایک بار صورت حال کے صحیح ادراک کے بعد امت میں تبدیلی کا احساس عام ہوگیا تو زیادہ مؤثر اور کارگر ترکیبوں کا ڈھونڈ نکالنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔

الکشن ختم ہوچکا ہے لیکن ہمارا کام ختم نہیں ہوا ہے بلکہ ہم نے تو اب اس کام کا آغاز کیا ہے۔ ملک بھر میں ایک مسلم سیاسی پارٹی کے قیام کے لئے مختلف سطح پر صلاح و مشورے کئے جارہے ہیں۔ جلد ہی بڑے پیمانے پر عوامی رابطے کا پروگرام بنایا جائے گا۔ ہمارے نمائندے ہر قابل ذکر مسلم آبادی میں پہنچیں گے اور ہر مسلمان کے دل پر دستک دیں گے۔ امیر ہو یا غریب، عالم ہو یا جاہل، مرد ہو یا عورت ہر شخص پر فرض ہے کہ وہ اپنی بساط بھر اس انقلابی قافلے کو ہر ممکن تعاون دیں۔ ایک روشن مستقبل کے لئے امت کے جانبازوں نے صرف اللہ کی نصرت کے بھروسے کوششوں کا آغاز کردیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کا شمار پیچھے رہ جانے والوں میں ہو۔

والسلام

آپ کا بھائی

راشد شاذ

(براہ کرم اس مکتوب کو زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہنچائیں)

ترکی میں اسلامی تحریک پر شب خون

اربکان کے جمہوری تجربے کی ناکامی سے اٹھنے والے چند سوالات کا دائرہ

گذشتہ ماہ حکومت ترکی نے باضابطہ طور پر رفاہ پارٹی کو کالعدم قرار دیئے جانے کی توثیق کردی۔ دریں اثناء حکومت کی طرف سے اس بات کی وضاحت بھی آگئی ہے کہ اگر اسلام پسندوں نے نئی سیاسی پارٹی بنانے کی کوشش کہ تو اس پر بھی پابندی لگادی جائے گی۔ سابق وزیر اعظم نجم الدین اربکان اور ان کے چھ ساتھیوں پر یہ پابندی عائد کردی گئی ہے کہ آنے والے پانچ سالوں میں وہ سیاست میں حصہ نہیں لے سکتے۔ دریں اثناء سرکاری طور پر اس اطلاع کے شائع ہوجانے کے بعد اب نجم الدین اربکان مستقبل کے لئے منصوبہ بندی کررہے ہیں اور اپنے ایک معتمد کو پارٹی کی قیادت کے لئے آگے بھی بڑھادیا ہے۔ اب تک یہ اندازہ نہیں ہورہا ہے کہ اربکان قانونی آنکھ مچولی کھیلنے میں سنجیدہ ہیں یا اندرون خانہ کوئی اور منصوبہ بنارہے ہیں۔

ترکی میں جو کچھ ہوا وہ صرف ایک مقامی معاملہ نہیں ہے بلکہ عالمی اسلامی تحریک کو لگام دینے کی کوشش ہے۔

گذشتہ انتخابات میں جب اربکان کی رفاہ پارٹی پارلیمنٹ میں سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری تھی اسی وقت ترکی کے سیکولر اداروں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ فوج جو خود کو کمال اتاترک کے ترکی کا محافظ سمجھتی ہے اس نے اس بات کی پوری کوشش کی کہ کسی طرح اربکان کو اقتدار سے دور رکھا جائے۔ اس مقصد کے لئے تان سوشلر اور مسعود یلماس کی چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کو مشترکہ اقتدار کی دعوت دی گئی لیکن جب جلد ہی یہ محاذ ٹوٹ گیا اور تان سوشلر نے اربکان کی قیادت میں حکومت میں شرکت پر رضامندی دے دی تو پہلی بار اتاترک کے ترکی میں ایک ایسے شخص کو وزارت عظمی کے منصب پر کام کرنے کا موقع ملا جس کا خواب اتاترک کے خواب سے مختلف تھا جو ترکی کو یورپی یونین کا ممبر بنانے کے بجائے اسلامی ممالک سے گہرے رابطے پر زور دیتا تھا اور جس کی نگاہیں خلافت اسلامی کی احیاء کی طرف اٹھتی تھیں۔ اربکان نے اپنے مختصر دور حکومت میں مسلم ممالک سے اپنے رابطے مضبوط کئے۔ امریکہ کی زبردست مخالفت کے باوجود تہران پہنچے اور ترک قوم کو مسلسل یہ احساس دلاتے رہے کہ ان کی جڑیں مغرب سے کہیں زیادہ ان اسلامی ممالک میں ہیں جن پر کبھی خلافت عثمانیہ کا جھنڈا لہراتا رہا ہے۔

ترکی میں رفاہ پر پابندی نے دنیا بھر میں اسلامی تحریک کے متوالوں کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا ہے کہ اسلامی انقلاب کا راستہ شاید پرامن جمہوری اور دستوری راستوں سے نہیں گزرتا ورنہ آخر کیا وجہ ہے کہ الجزائر میں اسلامک سالویشن فرنٹ کو انتخابات میں زبردست کامیابی کے باوجود اقتدار سے روک دیا گیا اور اب وہاں فوج نے بزور قوت اقتدار پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ ملک میں خانہ جنگی کا ماحول ہے اور ایک محتاط اندازے کے مطابق اب تک کوئی اسی ہزار افراد اس خونریز خانہ جنگی کا شکار ہوچکے ہیں۔ اربکان اور ان کے ساتھیوں پر پابندی ترکی کو بھی کچھ اسی راستے پر لے جاسکتی ہے۔ رفاہ پارٹی نے برسہا برس کی محنت کے بعد ترک عوام کو اسلام کی طرف واپسی کی دعوت دی یہاں تک کہ جب عوام کی ایک بڑی اکثریت ان کے ساتھ ہوگئی اور اسلامی تحریک ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوگئی تو بالآخر فوجی جرنیلوں کو یہ بات گوارہ نہ ہوئی کہ اس پرامن تحریک کو آگے بڑھتا دیکھیں۔ اربکان تو انتہائی حد تک پرامن تھے۔ کوئی جمہوری اصول ایسا نہ تھا جس کی انھوں نے خلاف ورزی کی ہو یہاں تک کہ خود اپنے دور حکومت میں وہ اسرائیل اور ترکی کے مابین چلے آرہے فوجی سمجھوتے کو منسوخ نہ کراپائے پھر جب فوج نے انھیں اسلامی اسکولوں کو بند کرنے کا حکم دیا تو اس کی بھی پاسداری کی گئی جس پر انھیں اپنے جوشیلے



☆ مسجد ایا صوفیہ جسے اتاترک نے میوزیم میں تبدیل کردیا

ساتھیوں کی مخالفت بھی سہنی پڑی لیکن ان سارے جمہوری اصولوں کی پاسداری کے باوجود رفاہ پارٹی کی بساط لپیٹ دی گئی۔

ترکی ہو یا الجزائر اسلامی تحریک کے علمبرداروں کو وہاں قوت علیا کے ماخذ کا تعین کرنے میں دھوکہ ہوا ہے۔ جن مسلم ممالک میں سیاسی کلچر پر فوجی کلچر کا غلبہ ہے وہاں صرف سیاسی کلچر پر اثرانداز ہونے سے کام نہیں چلے گا۔ اس کی ایک واضح مثال پاکستان ہے جہاں جنرل ضیاء الحق نے فوجی کلچر کے ذریعے سیاسی کلچر کو مسلسل گیارہ سال لگام دیئے رکھا۔ جنرل ضیاء الحق کو اسلام کی جیسی بھی سمجھ بوجھ تھی وہ اس کے مطابق بلاکسی روک ٹوک کے کام کرتے رہے گویا فوج کے اداروں میں چند صلح لوگوں کی ٹیم کے وجود میں آجانے سے ملک کا راستہ متعین کرنے میں دشواری نہ ہوئی۔ اس کے برعکس الجزائر اور ترکی میں ہزارہا افراد کی زندگی بھر کی محنتوں کو فوج نے چند لمحے میں لپیٹ کر رکھ دیا۔ اس سے پہلے مصر میں اخوان المسلمین کو جمہوری راستے سے انقلاب برپا کرنے میں مسلسل ناکامی کا سامنا ہوتا رہا ہے۔ اربکان اور ان جیسے تمام اسلام پسندوں کی مشکل یہ ہے کہ ان کی تربیت ایک جمہوری کلچر میں ہوتی ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پرامن طریقے سے شیطانی بیلیٹ باکس سے انقلاب کا جن برآمد ہو جائے گا حالانکہ ایسا ممکن نہیں۔

ترکی خلافت عثمانیہ کا دار الحکومت رہا ہے۔ مغرب مانتا ہے کہ اگر ترکی میں دوبارہ اسلامی تحریک نے قوت حاصل کرلی تو خلافت کے خواب کو بیچ کر دکھانے کا داعیہ عام آرزو کا حصہ بن جائے گا پھر جغرافیائی اعتبار سے ترکی میں اسلامی تبدیلی آس پاس کے مسلم علاقوں کو متاثر کرے گی۔ وسط ایشیا کی ریاستیں اور مشرق وسطی بہت جلد اس تحریک کی لپیٹ میں آجائے گا اور اگر ترکی پر اسلام پسندوں کو پورا کنٹرول حاصل ہوگیا تو احیاء خلافت کے آرزو مندوں کا راستہ روکنا مشکل ہو جائے گا۔ ترکی کو عالم اسلام سے دور رکھنے کے لئے امریکہ اور مغربی ممالک مسلسل فکرمند رہے ہیں۔ امریکہ تو مسلسل ترکی کو مالی امداد بھی دیتا رہا ہے۔ ترکی کو مالی امداد دلوانے میں اسرائیل کی

ترکی میں رفاہ پر پابندی نے دنیا بھر میں اسلامی تحریک کے متوالوں کو یہ سوچنے پر مجبور کردیا ہے کہ اسلامی انقلاب کا راستہ شاید پرامن جمہوری اور دستوری راستوں سے نہیں گزرتا۔

ترکی ہو یا الجزائر اسلامی تحریک کے علمبرداروں کو وہاں قوت علیا کے ماخذ کا تعین کرنے میں دھوکہ ہوا ہے۔ جن مسلم ممالک میں سیاسی کلچر پر فوجی کلچر کا غلبہ ہے وہاں صرف سیاسی کلچر پر اثرانداز ہونے سے کام نہیں چلے گا۔

حکومت کا بھی بڑا ہاتھ ہے جو مسلسل امریکہ پر دباؤ ڈالتی رہتی ہے کہ وہ ترکی کو امداد فراہم کرے۔ یہودی دانشور جانتے ہیں کہ اسرائیل کی بقا اسی وقت تک ہے جب تک ترکی سے خلافت کے قیام کی آواز نہیں اٹھتی اس لئے کہ اسرائیل کا وجود خلافت کے خاتمے کے بعد ہی ممکن ہو پایا ہے اس لئے عالمی یہودی قیادت ہر قیمت پر ترکی کو سیکولرزم کا گہوارہ بنا کر رکھنا چاہتی ہے۔ اسے خوب یاد ہے کہ جب جنگ عظیم اول کے موقع پر یہودی تاجر خلیفہ عبد الحمید کے پاس پہنچے تھے اور انھیں ہر طرح کی مالی تعاون کی پیش کش کی تھی بشرطیکہ وہ فلسطین میں ایک چھوٹی سی جگہ سلطنت اسرائیل کے قیام کے لئے دے دیں تو خلیفہ نے ان ساری پیش کش کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ وہ اپنے جیتے جی سرزمین فلسطین کا ایک انچ بھی یہودیوں کو نہیں دے سکتے۔ یہودی دانشوروں کا احساس ہے کہ ترکی جب تک اسلامی تحریک سے محفوظ رہے گا تب تک خلافت کی تحریک کو دبانا آسان ہوگا اور اسی میں اسرائیل کی بقا ہے پھر اسرائیل اور ترکی میں باضابطہ فوجی معاہدے ہیں یہاں تک کہ ساتھ ساتھ فوجی مشقیں بھی کی جاتی ہیں۔ اسرائیل اور امریکہ ترکی کے ہوائی اڈوں پر اپنا حق رکھتے ہیں گویا خلافت کی سرزمین ترکی کو پوری طرح امریکہ اور اسرائیل نے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوری محاذ پر سیکولرزم کی ناکامی کے بعد اب بزور بازو اسلامی تحریک کا راستہ روکنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ترکی ایک علامتی ملک ہے، وہاں اسلامی تحریک کو آسانی کے ساتھ زمام اقتدار سنبھالنے نہیں دیا جائے گا اس لئے اسلام پسندوں کو یہ سوچنا ہوگا کہ آنے والے دنوں میں وہ محض قانونی اور دستوری طریقے سے جنگ لڑیں گے یا ترک فوج، امریکہ، اسرائیل اور مغرب کے صلیبی اداروں سے فیصلہ کن معرکہ آرائی کے لئے کسی نئی حکمت عملی کی ضرورت ہے۔ ☐



☆ پھر کوئی صلاح الدین اٹھے

ہندوستان میں مسلمانوں کا امیر کون ہے؟

امارت شرعیہ بہار کے یوم تاسیس سے اٹھنے والے سوالات پر ایک نظر

پٹنہ کے مضافات میں امارت شرعیہ کے نام سے مسلمانوں کا ایک ادارہ کوئی پون صدی سے خدمت میں مصروف ہے۔ کسی بھی مسلم ادارے کے لیے اتنی عمر کو پہنچنا اور اپنے کام میں مستقل مزاجی کے ساتھ جٹے رہنا بذات خود ایک بڑا کارنامہ ہے جس کے لیے اہالیان امارت شرعیہ یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔ گذشتہ دنوں امارت شرعیہ کا یوم تاسیس منایا گیا۔ اس موقع پر قائدین امارت کے علاوہ عمائدین شہر اور اہالیان شریعت کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اور ایک بار پھر ناظم امارت شریعہ نے لوگوں سے اس بات کا عہد لیا کہ وہ ہر قیمت پر اسلام کے اجتماعی نظام کو باقی رکھیں گے۔ کسی ایسے پرانے ادارے میں جسے دین و شریعت کے حوالے سے لوگوں میں اعتبار حاصل ہو اگر یوم تاسیس کے موقع پر تجدید عہد کا احساس پیدا ہوتا ہے، تو یہ بھی ایک نیک فال ہے جس سے کم از کم یہ توقع تو پیدا ہوتی ہے کہ وابستگان ادارہ کی نگاہوں سے ان کا مقصد اوجھل نہیں ہوا ہے البتہ ار بار بار کا تجدید عہد ان مقاصد کی طرف پیش قدمی میں معاون نہیں بنتا جس کے لئے وہ ادارہ قائم ہوا ہے تو پھر یہ سمجھنا چاہیئے کہ نہ تو تجدید عہد والوں کو اس بات کا شعور ہے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور نہ ہی اس عہد کے راستے کی دشوار گذاریوں کا واقعی احساس۔ ورنہ آخر کیا وجہ ہے کہ پچاس سال سے زائد عرصے پر محیط امارت شریعہ کی کوششوں سے اب تک ملک میں کسی شرعی نظام کا قیام تو درکنار کسی ایسی ضرورت کا عمومی احساس بھی پیدا نہیں ہوسکا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی نظام کفر کی معصیت میں اسی طرح لت پت ہے۔ وہ اسلام کے اجتماعی نظام تصور سے ناآشنا ہیں اور نظام جبر کی پچاس سالہ زندگی کے بعد بھی ان کے اندر اسی نظام جبر سے نکل کر اسلامی نظام عدل کے قیام کی کوئی عوامی تحریک نہیں برپا ہوپائی ہے۔

عام مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ملک میں آخر یہ کیسا شرعی نظام قائم ہے جس کا نہ تو ملک کے نظام کفر پر کوئی اثر مرتب ہوتا ہے اور نہ تو نظام کفر اس شرعی نظام سے خوف محسوس کرتا ہے حالانکہ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اگر کوئی واقعی شرعی نظام ملک کے کسی حصے میں قائم ہوجاتا تو اسے نظام کفر کے حواری اپنی موت کا اعلان سمجھتے لیکن عملاً اس ملک میں شریعت کا نظام اور کفر کی حکمرانی دونوں ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ پھر یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ شریعت کے دعویدار اور شریعت کی امارت پر متمکن حضرات بھی اسی نظام کفر کی اطاعت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اجتماعی زندگی کے تمام مسائل ان کے یہاں بھی نظام کفر کی ہدایات کے مطابق انجام پاتے ہیں۔ سیاسی اور معاشی زندگی کلی طور پر نظام کفر کی اطاعت میں گزر رہی ہے۔ جو لوگ اس شرعی نظام سے باہر زندگی گزار رہے ہیں اور جو لوگ اس نظام سے خود کو کسی طرح وابستہ تصور کرتے ہیں ان دونوں کی زندگیوں میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا، پھر آخر یہ کیسی شرعی امارت ہے اور یہ کس شریعت کے حاملین ہیں، جو نظام کفر کی سیاسی بالادستی کو برضا و رغبت قبول کیے بیٹھے ہیں؟



تاسیسی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے قاضی شریعت مولوی مجاہد الاسلام

قاسمی نے اس بات پر زور دیا کہ مسلمان امارت شرعیہ کی اطاعت میں اپنی زندگی گزاریں۔ آپ نے فرمایا "امیر کی اطاعت واجب ہے۔ امیر کے بغیر مسلمانوں کے لیے زندگی گزارنا جائز نہیں" اور یہ کہ "جو شخص ایسی موت مرا کہ جس کا کوئی امیر نہیں تھا وہ جاہلیت کی موت مرا۔" قاضی صاحب نے جو کچھ فرمایا یہ دراصل ایک حدیث کا مفہوم ہے اور امت کی شیرازہ بندی کے لئے یہ نکتہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے البتہ عام مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ سرزمین ہندوستان میں امت کا امیر کون ہے؟ اور وہ کسے اطاعت کی باگ ڈور سونپ دے؟ امیر کی اطاعت کے حوالے سے بے شمار لوگ امارت کے دعویدار ہیں۔ کوئی امیر شریعت بنا بیٹھا ہے تو کسی کو امیر اللہ ہونے پر اصرار ہے۔ بے شمار جماعتیں ہیں جو مقامی یا قومی سطح پر اپنے اندر امارت و خلافت کا نظم قائم کئے بیٹھی ہیں گویا مسلمانوں کے اندر اتنے بہت سے امیر پیدا ہوگئے ہیں کہ عام مسلمانوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ کس سے بیعت کرے اور کسے ٹھکرادے۔ پھر امارت کا دعویدار ہر شخص اپنے ماننے والوں کو مختلف سمتوں میں لے جانا چاہتا ہے۔ ایک امیر کے نزدیک دوسرا امیر قابل اعتبار نہیں۔ سادہ لوح مسلمان پریشان ہے کہ وہ کدھر جائے اور جہالت کی موت سے کیسے بچے؟ اسلامی شریعت کے مطابق کسی شخص کی خلافت یا امارت قائم ہوجانے کے بعد اگر کسی گوشے سے کوئی اور شخص قیادت کا دعویدار بن کر سامنے آئے تو منتخب امیر کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ قیادت کے نئے دعویدار کو سختی کے ساتھ کچل ڈالے۔ موجودہ ہندوستان میں جہاں دین و شریعت کے حوالے سے جہاں بہت سی امارتیں قائم ہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ کون معتبر امیر ہے؟ اور کس کا دعوی امارت بغاوت کے مترادف ہے؟ پھر عام مسلمان کرے تو کیا کرے؟

جو لوگ دین و شریعت کا ذرہ برابر بھی شعور رکھتے ہیں۔ انھیں یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ اسلام میں امیر امت کے امور کا نگراں ہوتا ہے۔ ایک وقت میں یہ ممکن نہیں کہ امت میں بہت سے امیر پیدا ہوجائیں اور ان سب کی قیادت تسلیم کرلی جائے پھر یہ بات بھی محل نظر ہے کہ شریعت کے حوالے سے جو لوگ امارت کی کرسی کو مزین کرنا چاہتے ہوں۔ انھیں اس بات کا شعور ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کا امیر اگر امت کے اوپر کوئی اختیار رکھتا ہے تو صرف اس بنیاد پر کہ وہ نگرانی خلیفہ رسول کی حیثیت سے امت کی شریعت کی اتباع میں زندگی گزارنے پر نگرانی کرتا رہے گا اور بس۔ رہے موجودہ امراء جو عین نظام کفر کی معصیت میں خود بھی زندگی گزار رہے ہیں اور اپنے ماننے والوں کو بھی اس نظام کفر کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی ترغیب نہیں دیتے تو ان کی امارت سرے سے قابل اعتبار نہیں۔ پھر اگر یہ لوگ سمع و طاعت کے حوالے سے اپنے مریدوں سے اتباع کی فرمائش کرتے ہیں تو یہ دراصل اپنی شریعت ایجاد کرنے کے مترادف ہے ورنہ اسلام میں ایک شرعی امارت کا تصور خلیفہ کی ذات سے وابستہ ہے اور اسے ہی اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ امت کی باگ ڈور پر اپنی کمان مضبوط رکھے۔

اسلام کی رو سے شریعت کا یہ تصور کہ وہ صرف نکاح و طلاق اور وراثت کے معاملے میں رہنمائی دے، ایک اجنبی تصور ہے یہ بھکشوؤں کا دین ایجاد کرنے کے مترادف ہے جس میں بے چارہ امیر صرف لوگوں کے دلوں پر حکومت کرسکتا ہے۔ اس کے پاس کوئی قوت نافذہ نہیں ہوتی کہ وہ حالات کی درستگی کے لیے فتنہ و فساد کے خاتمے کی خاطر قوت کا استعمال کرسکے۔ ہمارے عہد کے امرائے شریعت یا امام اللہ قسم کے حضرات تو یہ بے چارے اپنے حلقوں میں خواہ امارت اور خلافت کے منصب پر کیوں نہ فائز ہوں واقعہ یہ ہے کہ ان بے چاروں کی بے چارگی اور موجودہ نظام کفر کے سامنے ان کی بے بسی ہر خاص و عام پر عیاں ہوتی ہے اور ان میں سے بیشتر امراء کی گردنوں میں کفار و مشرک سیاسی آقاؤں کی غلامی کا طوق پڑا ہوتا ہے۔ ان میں سے شاید ہی کوئی ہو جس کی راہ و رسم نظام کفر کے درباروں تک نہ ہو یا جن کی وابستگیاں کسی نہ کسی غیر مسلم سیاسی پارٹی سے نہ ہوں۔ کیا مسلمانوں کا امیر اتنا بے بس ہوگا کہ معمولی حکمراں اسے خاطر میں نہ لائیں یا وہ خود کو ان حکمرانوں کا حاشیہ نشیں بننے پر فخر محسوس کرے؟

اسلام کی رو سے شریعت کا یہ تصور کہ وہ صرف نکاح و طلاق اور وراثت سے معاملے میں رہنمائی دے، ایک اجنبی تصور ہے یہ بھکشوؤں کا دین ایجاد کرنے کے مترادف ہے جس میں بے چارہ امیر صرف لوگوں کے دلوں پر حکومت کرسکتا ہے اس کے پاس کوئی قوت نافذہ نہیں ہوتی کہ وہ حالات کی درستگی کے لیے فتنہ و فساد کے خاتمے کی خاطر قوت کا استعمال کرسکے۔

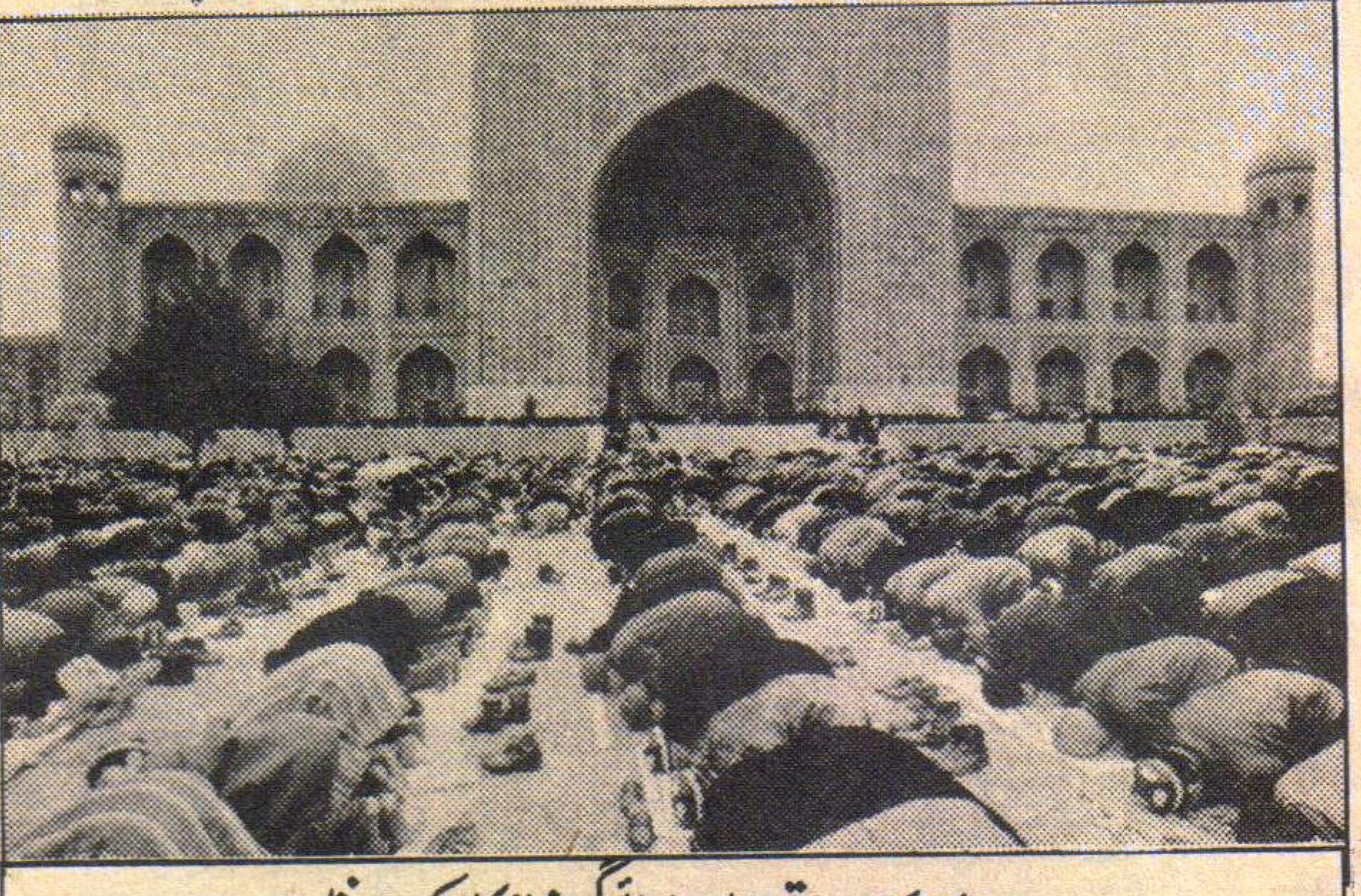
یہ بات ہم سے کہیں زیادہ امارت شرعیہ کے حاملین سمجھتے ہیں کہ اس ملک میں ایک شرعی نظام کے قیام کی ضرورت عبث ہے۔ ایسا اس لئے بھی کہ ہندوستان تاریخی اعتبار سے دار الاسلام رہا ہے جہاں صدیوں تک شریعت نافذ رہی ہے۔ جب کوئی دار الاسلام کسی حادثے کے نتیجے میں دار الاسلام کی حیثیت کھودے تو شریعت کی رائے یہ ہے کہ مسلمان اسے دوبارہ دار الاسلام بنانے کے لئے جدوجہد کرے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ملک میں شریعت کو نظام کفر کا تابع رکھنے کے بجائے اس کے ہمہ گیر نفاذ کے لیے جدوجہد شروع کردی جائے تاکہ اس ملک میں اور اس سے آگے بڑھ کر عالمی سطح پر شرعی امارت کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو جس میں ہر مسلمان کو ایک اجتماعی اسلامی زندگی جینے کا موقع مل سکے ورنہ امارت کے بہت سے غیر شرعی دعویدار اس امت کے انتشار میں مزید اضافے کا سبب بنیں گے۔

وسط ایشیا پر کمیونسٹ حکمرانوں کی گرفت ڈھیلی

سابق سوویت یونین کی مسلم ریاستوں میں اسلامی بیداری کی تحریک پر ایک رپورٹ

اسلام کی سرزمین پر کفر کے جو حکمراں مختلف ملکوں کی زمام کار سنبھالے بیٹھے ہیں ان بیچاروں کے ساتھ بھی بڑی مصیبت ہے۔ ان کے خیالات خواہ کچھ بھی ہوں اور عملاوہ ہر لحہ اسلام دشمنی کی پالیسی پر کیوں نہ چل رہے ہوں واقعہ یہ ہے کہ ان بے چاروں کو ہر لحہ اسلام سے اپنی وابستگی کا یقین دلانا پڑتا ہے۔ پڑوسی ملک پاکستان کا معاملہ لے لیجئے۔ بے نظیر بھٹو ہوں یا نواز شریف۔ ان بے چاروں کے اقتدار کا استحکام تو امریکی اشارے کا مرہون منت ہوتا ہے لیکن انھیں اپنی وابستگی اسلام سے بتانی پڑتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ وزارت عظمی کا عہدہ سنبھالتے ہی یہ حضرات مکہ کی طرف بھاگتے ہیں اور پہلی فرصت میں عمرے کی تعمیل کے ذریعے عوام الناس کو یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ ان کی اسلام سے وابستگی پکی ہے۔ البتہ گذشتہ چند برسوں میں اسلام سے وابستگی کے ثبوت کا یہ معاملہ صرف پاکستان تک ہی محدود نہیں رہ گیا ہے بلکہ سابق سوویت یونین کی مسلم ریاستوں کے کمیونسٹ حکمرانوں کو بھی اب عمرے کی ضرورت پیش آنے لگی ہے۔ وسط ایشیا کی پانچ مسلم ریاستوں میں سے ترکمانستان اور ازبکستان کے صدور مکہ مکرمہ کے سفر سے شرف یاب ہو چکے ہیں لیکن معاملہ یہ ہے کہ عوام میں اسلام کی طرف غیر معمولی جوش وجذبے نے ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے کہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ شاید اب عمرہ اور اسلام کی حمایت میں صرف زبانی بیانات سے کام نہیں چلے گا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اسلامی نظام کے لیے عملی اقدامات بھی کرنے ہوں گے۔

کوئی ستر سال تک کمیونسٹوں کے تسلط میں رہنے کے بعد وسط ایشیاء کی مسلم ریاستیں کسے معلوم تھا اس طرح اچانک بغیر کسی خون خرابے کے آزاد ہو جائیں گی۔ دنیا سرخ فوج سے کانپتی تھی اس لیے کہ سوویت یونین کے پاس دنیا کی سب سے بڑی فوجی قوت موجود تھی۔ دنیا بھر کے مسلمان سمرقند و بخارا کے تاریخی شہر کو دوبارہ حاصل کرنے کی امید کھو بیٹھے تھے لیکن حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ آنا فانا سوویت یونین کا جاہ جلال خاک میں مل گیا اور اس ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے معجزاتی طور پر مسلم ریاستوں کو کمیونسٹوں کے نظام جبر سے نجات مل گئی۔ جو لوگ بین الاقوامی سیاست سے ذرا بھی واقفیت رکھتے ہیں انھیں خوب معلوم ہوگا کہ سوویت یونین کے زوال سے دو سال پہلے تک بڑے بڑے سیاسی ماہرین اس بات کی پیش گوئی نہیں کر پائے تھے کہ دنیا کے نقشے پر سب سے بڑا نظام کفر اور دنیا کی سب سے بڑی فوجی قوت کو آنا فانا اس طرح زوال ہو جائے گا۔ سچ ہے کہ دنیا میں امکانات کے ہر پہلو کا پہلے سے اندازہ لگانا محض انسانی اندازوں کے تجربوں سے ممکن نہیں۔



☆ سمرقند میں ادائیگی نماز کا ایک منظر

آخر کچھ تو ہے کہ سوویت یونین کے زوال سے وسط ایشیا کی تاریخی سرزمین بغیر کسی خون خرابے کے امت کے حوالے کر دی گئی ہے اور اس طرح اب عالمی امت اسلامیہ کا کوئی بھی ایسا حصہ نہیں ہے جہاں احیائے اسلامی کی تحریک اپنی پوری قوت کے ساتھ سرگرم ہونے سے رہ گئی ہو۔ اسلام کی مرکزی سرزمین خصوصا جزیرہ العرب اور شمالی افریقہ ان دنوں مسلسل احیائی تحریک کی زد میں ہے۔ یہی نہیں بلکہ مغرب میں نوآباد مسلمانوں کی جو چھوٹی چھوٹی آبادیاں وجود میں آئی ہیں وہاں بھی اسلام اپنی پوری شناخت کے ساتھ لوگوں کی زندگی پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ خلافت کے ادارے کو ختم ہوئے کوئی پون صدی گزر چکی ہے۔ مغرب سمجھتا تھا کہ شاید مسلمان اب اس شعور سے ہی غافل ہو جائیں گے کہ نظام خلافت ان کی مذہبی زندگی کا ایک حصہ ہے لیکن اچانک مغربی پالیسی سازوں کے سارے اندازے گڈمڈ ہونے لگے ہیں۔ نظام خلافت کے سب سے اہم دشمن برطانوی سامراج کے دار الحکومت لندن میں خلافت کے قیام کے لیے ولولہ انگیز کانفرنسیں منعقد ہو رہی ہیں اور برطانیہ کی دانش گاہوں اور علمی اداروں میں برطانوی مسلمانوں کی نئی نسل ببانگ دہل اس

بات کا اعلان کر رہی ہے کہ جس برطانیہ نے خلافت کی بساط لپیٹی ہے وہ اس کی بساط لپیٹ کر جلد ہی نظام خلافت کا قیام ممکن کر دکھائیں گے۔ موجودہ دنیا کی سب سے مضبوط حکومت اور عالمی غنڈہ گردی کے چیمپئن امریکہ کو ہر لمحہ رمزی یوسف جیسے جوانوں سے خوف آتا ہے گویا عالمی سطح پر ایک نئے فیصلہ کن معرکے کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس تناظر میں اگر دیکھا جائے تو وسط ایشیا کے مسلم ملکوں کی اچانک غیر متوقع آزادی دراصل ایک بڑی اسکیم کا حصہ ہے جہاں ایک طویل عرصے تک اسلام کی غیر حاضری کے باوجود اسلام کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ دنیا کے دوسرے حصے سے کچھ کم نہیں۔

وسط ایشیا کے کمیونسٹ حکمرانوں کو یہ بات پریشان کیے دیتی ہے کہ ان ممالک میں احیائے اسلامی کی تحریک کو روز بروز فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ خاص طور پر وادی فراغنہ نئی اسلامی تحریک کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ فراغنہ ایک ایسا حصہ ہے جس کا کچھ حصہ کرغستان اور کچھ حصہ تاجکستان اور ازبکستان میں آتا ہے اور جہاں آبادی کا تناسب ملک کے دوسرے خطوں سے بہت زیادہ ہے۔ کمیونسٹ حکمرانوں کے لیے جو چیز پریشانی کا باعث ہے وہ یہ کہ اسلامی تحریک کے علمبردار اب محض بے ضرر تصوف کی تبلیغ نہیں کرتے بلکہ اسلام کے عالمی غلبے کا خواب ان کے ایجنڈے پر سب سے اوپر ہے۔ پھر یہ بات بھی تشویش کا باعث ہے کہ وہ موجودہ صورت حال کو ہر صورت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ گذشتہ دسمبر میں ازبکستان میں چار پولیس والوں کی ہلاکت نے مسئلہ کو ایک نیا رخ دے دیا ہے۔ ازبکستان کے صدر اسلام کریموو کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا عمرہ عوام کو ان کی اسلامیت باور کرانے میں کچھ

آخر کچھ تو ہے کہ سوویت کے زوال سے وسط ایشیا کی تاریخی سرزمین بغیر کسی خون خرابے کے امت کے حوالے کر دی گئی ہے اور اس طرح اب عالمی امت اسلامیہ کا کوئی بھی ایسا حصہ نہیں ہے جہاں احیائے اسلامی کی تحریک اپنی پوری قوت کے ساتھ سرگرم ہونے سے رہ گئی ہو۔

زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوا اس لیے کہ اسلامی تحریک کے بیشتر قائدین ان کی حکومت پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں نئی اسلامی تحریک کے قائدین بار بار پولیس کی زیادتیوں کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔ اسلام پسندوں کی بڑھتی قوت کو روکنے کے لیے 1995ء میں شمالی ازبکستان کی مرکزی مسجد بند کر دی گئی تھی اور پھر اس کے بعد یہ پتہ نہیں چلا کہ اس مسجد کے امام اچانک کہاں غائب ہو گئے۔ صدر کریموو کا کہنا ہے کہ کرغستان کے شہر اوش میں وہابیوں نے اپنے جال پھیلا رکھے ہیں اور وہ کرغستان میں بھی طالبان جیسی حکومت کے قیام کے لیے کوشاں ہیں البتہ تاجکستان کے کمیونسٹ حکمرانوں نے مصالحت کا رویہ اختیار کیا ہے اور بعض اسلام پسندوں کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا ہے۔ ازبکستان کی طرح کرغیز حکومت بھی احیائی تحریک

نظام خلافت کے سب سے اہم دشمن برطانوی سامراج کے دارالحکومت لندن میں خلافت کے قیام کے لیے ولولہ انگیز کانفرنسیں منعقد ہو رہی ہیں اور برطانیہ کی دانش گاہوں اور علمی اداروں میں برطانوی مسلمانوں کی نئی نسل ببانگ دہل اس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ جس برطانیہ نے خلافت کی بساط لپیٹی ہے وہ اس کی بساط لپیٹ کر جلد ہی نظام خلافت کا قیام ممکن کر دکھائیں گے۔

سے خوف زدہ ہے۔ گذشتہ دنوں وزارت امن کی طرف سے اس سلسلے میں وارننگ بھی جاری کی گئی ہے گو کہ ابھی کرغستان اور قزاقستان میں اسلامی بیداری کی تحریک میں وہ شدت نہیں آئی ہے جو ازبکستان میں دیکھنے کو ملتی ہے لیکن جس شدت کے ساتھ لوگوں میں اسلام کے سیاسی نظام کو قائم کرنے کا شعور بڑھتا جا رہا ہے اس سے مبصرین کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہا کہ یہاں اسلامی تحریک کو فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہونے میں اب زیادہ دن نہیں رہ گئے ہیں البتہ ابھی ازبکستان میں بیداری کا درجہ حرارت سب سے زیادہ ہے شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ازبکستان روایتی طور پر سمرقند و بخارا کا ملک ہے جہاں اسلامی تہذیب کی علامتیں آج بھی تروتازہ نظر آتی ہیں گو کہ ان ممالک میں سرکاری سطح پر اس بات کی پوری کوشش کی جا رہی ہے کہ کسی طرح اسلامی بیداری کی تحریک کو موجودہ نظام کے اندر جذب کر لیا جائے اور کچھ لے دے کر نئی اسلامی تحریک کے قائدین کو غلبہ اسلام کے ایجنڈے سے منحرف کر دیا جائے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ آنے والے دنوں میں جب وسط ایشیاء کی ریاستوں پر مسلم دنیا کی بدلتی صورت حال کا براہ راست اثر پڑے گا اور اس خطے کے اسلامی قائدین عالمی مسلم قائدین سے زیادہ رابطے میں آئیں گے تو اسلام کے سیاسی ایجنڈے کو مزید موخر کرنا مشکل ہو جائے گا۔ تو کیا وسط ایشیا کی مسلم ریاستیں ایک بار پھر سے عالمی نظام خلافت میں اپنا روایتی رول ادا کریں گی؟ کہیں یہ سب کچھ واقعات عالم کو اسی طرف تو نہیں لئے جا رہے ہیں؟ یہ سوچ کر مغرب کے پالیسی ساز خاصے پریشان دکھائی دیتے ہیں خاص طور پر جب پڑوسی ریاست ترکی میں اسلامی تحریک نے اپنی بنیادیں مضبوط کر لی ہوں۔ □

پاکستان میں لوٹ کھسوٹ کی بے نظیر مثال

پڑوسی ملک سے ایک شرمادینے والی چشم کشا رپورٹ

مسٹر دس فیصد اور نصرت بھٹو کے کارنامے بعض ہندوستانی سیاستدانوں کا تو ذکر ہی کیا موبوتو سیسی سیکو اور جین بائپسٹ بوکاسو کی بے اعتدالیوں کو بھی شرمادینے والی بدعنوانی کی لہر میں سابق پاکستانی وزیر اعظم کے شوہر آصف زرداری نے بیسوں ملین ڈالر کی رقم ملک سے کھینچی ہے۔ اس کا انکشاف حکومت پاکستان کی طرف سے کرائی گئی تفتیش اور مغربی ذرائع ابلاغ نے کیا ہے۔

نواز شریف حکومت کی تحویل میں آئے دستاویزات سے جنہیں نیویارک ٹائمز کے حوالے کیا جاچکا ہے جس نے اس واقعے کو اپنی ذاتی چھان بین کی روشنی میں شائع کیا ہے، بھٹو فیملی کے غیر ملکی کھاتے میں جمع شدہ ایک سو ملین ڈالر کی رقم اور جائیدادوں کا پتہ چلا ہے اور یہ تو محض نمونہ ہے۔ پاکستان کو بیچ دینے والے آصف زرداری نے جو ایک عرصے سے عوامی حلقوں میں مسٹر دس فیصد کے نام سے معروف ہیں، پاکستانی حکام کی اطلاع کے مطابق ملک کی ڈیڑھ بلین ڈالر کی دولت لوٹی ہوگی۔



زرداری نے اپنی بیوی کی ناک کے نیچے ہی سرکاری خزانے کو خالی کرنے کے سارے ہتھکنڈے اختیار کیے، دفاعی معاہدے، پاور پلانٹ پروجیکٹ، سرکاری ملکیت میں چلنے والی صنعتوں کی نجی کاری، نشریاتی لائسنسوں کی منظوری، ملک کی چاول کی کثیر پیداوار کو برآمداتی اجارہ داری کی منظوری، پی آئی اے کے لیے طیاروں کی خریداری، ٹکسٹائل برآمداتی کوٹا کی تقسیم، تیل اور بس پرمٹوں کی منظوری، تعمیر شدہ شوگر ملوں کو اجازت نامے کا اجراء اور سرکاری آراضی کی فروخت سب معاملات زرداری کی ہوس کا شکار ہوئے۔

نیویارک ٹائمز کو الگ الگ دیئے گئے انٹرویو میں بے نظیر بھٹو اور زرداری دونوں نے مذکورہ لوٹ کھسوٹ سے انکار کرتے ہوئے دعوی کیا کہ انھیں سیاسی پروپیگنڈے کا شکار بنایا جارہا ہے۔

اقتدار اور لوٹ کھسوٹ کی حیرت ناک کہانی زیادہ تفصیل سے جمعہ کے اخبار میں شائع ہوئی جو اندرونی دو صفحات پر تقریباً دس ہزار الفاظ میں پھیلی ہوئی تھی اس کہانی کے مصنف ٹائمز کے جنوب ایشیائی بیورو کے چیف اور دو بار پلیٹزر انعام یافتہ جون برنز ہیں۔

جون برنز کا بیان ہے کہ اس کے بعد کہ پاکستانی تفتیش نے بھٹو خاندان سے متعلق بعض کاغذات جن میں کئی موٹے بائنڈر بھی شامل تھے، دینے شروع کیے ان کے اخبار نے پورے معاملے کی تین ماہ تک باریکی سے چھان بین کی۔ ان کاغذات کی بنیاد پر کی گئی تفتیش سے اسے اس عام خیال کی تائید ہوئی کہ پاکستان دنیا کے چند بدعنوان ممالک میں سے ہے۔ ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کی فہرست میں پاکستان کو بدعنوانی میں نائیجیریا کے بعد دوسرے نمبر پر اور ہندوستان کو آٹھویں نمبر پر رکھا گیا ہے یعنی وہ بھی زیادہ پیچھے نہیں ہے۔

حکومت پاکستان کو بھٹو خاندان کی غیر ملکی املاک کا علم اسی وقت ہوسکا جب اس نے غیر ممالک میں بدعنوانی کے ثبوتوں کی تلاش کی ہے۔ نیویارک کی تفتیشی ایجنسی جولس کرول کی خدمات حاصل کیں۔ ابھی یہ ایجنسی یوروپ میں ادھر ادھر سراغ کی تلاش میں گھوم رہی تھی کہ ایک مخبر نے بعض ایسے کاغذات فروخت کرنے کی پیش کش کی جو جین شلیگل ملچ کے جینیوا آفس سے حاصل کیے گئے تھے۔ یہ وہی صاحب ہیں جو بے نظیر بھٹو کے میاں کے مطابق یوروپ میں بیس سال سے ان کے قانونی مشیر اور خاندانی دوست ہیں۔ نامعلوم مخبر نے ابتداء کاغذات کے عوض دس ملین ڈالر کا مطالبہ کیا تھا اور آخر کار اس نے اس وقت پاکستانی عہدیداروں کے ہاتھوں نقد ایک ملین ڈالر میں بیچ دیا تب انھوں نے ان کاغذات کی آتشیں نوعیت کو دیکھتے ہوئے معاملے کی تفتیش شروع کردی۔

ان کاغذات میں سوئزر لینڈ کے کھاتوں، دبئی اور جنیوا کے سٹی بنکوں کے

متعدد حسابات، رشوت کی ادائیگی کا وعدہ کرنے والے اعلیٰ افسران کے خطوط، رشوت کی شرح کی تفصیل، ان کمیشنوں پر سمجھوتہ جن میٹنگوں میں ہوا ان کے میمورنڈم، سودوں میں ملوث آف شور کمپنیوں کی شمولیت کے سرٹیفکیٹ شامل ہیں جن میں سے زیادہ تر کمپنیاں برطانوی ورجن آئی لینڈ میں رجسٹرڈ ہیں۔

تفتیش کاروں کی دریافت کے مطابق سب سے بڑی واحد ادائیگی میں مشرق وسطیٰ کے ایک سونے کے بیوپاری نے جسے بے نظیر حکومت نے سونے کی درآمد پر ایسی اجارہ داری بخش دی تھی جو پاکستان کی زیورات کی پوری صنعت چلانے کے لیے کافی تھی۔ زرداری کے ایک کھاتے میں دس ملین ڈالر جمع کیے تھے۔ یہ روپیہ دبئی کے ایک سٹی بینک کھاتے میں رکھا گیا تھا اور اس طرح کے کئی اکاؤنٹ زرداری نے کھول رکھے تھے۔

مالی استحصال کا یہ سلسلہ جنوری 1994 میں بے نظیر حکومت کے دوسرے دور کے آغاز سے شروع ہوا جب ان کے معتمد خاص شلنگیل لچ نے برٹس ورجن آئی لینڈ میں کیپری کارن ٹریڈنگ ایس اے کے نام سے ایک کمپنی قائم کی اور اس کا سب سے بڑا مالک زرداری کو بنایا۔ سلنگیل لچ نے اپنا تعلق بھٹو خاندان سے اپنی ایرانی نژاد بیوی اور بے نظیر کی ماں نصرت بھٹو کے درمیان روابط کے ذریعے پیدا کیا جو کہ ایران میں ہی پیدا ہوئی تھیں۔ نو ماہ بعد 5 اکتوبر 1994 کو سٹی بینک کی دبئی شاخ میں کیپری کارن ٹریڈنگ کے نام سے ایک کھاتہ کھولا گیا اور اسی دن سٹی بینک کی اسی کھاتے کی ایک جمع داری پرچی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں رزاق کی کمپنی یعنی اے آر وائی ٹریڈرس نے پانچ ملین ڈالر جمع کرائے تھے۔ دو ہفتوں کے بعد ایک دوسری جمع داری پرچی اس بات کی شاہد ہے کہ آے آر وائی کمپنی نے مزید 5 ملین ڈالر جمع کرائے۔

نومبر 1994 میں پاکستان کی وزارت تجارت نے رزاق کو یہ اطلاع دی کہ اسے کم از کم اگلے دو برسوں کے لیے ایسا لائسنس مل گیا ہے جس کی رو سے وہ پاکستان کا سونے کا سب سے بڑا منظور شدہ امپورٹر بن گیا ہے۔

نیو یارک ٹائمز کو ایک انٹرویو کے دوران رزاق نے اعتراف کیا کہ اس نے اس لائسنس کا استعمال پاکستان میں 500 ملین ڈالر کا سونا درآمد کرنے کے لیے کیا تھا اور یہ کہ اس نے بے نظیر اور زرداری سے ملنے کے لیے کئی بار اسلام آباد کا سفر کیا تھا لیکن اس نے اس بات سے انکار کیا کہ کوئی خفیہ سودا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ میں نے زرداری کو ایک پائی بھی نہیں دی ہے۔ اس کا اشارہ اس طرف تھا کہ سٹی بینک کے وہ کاغذات جعلی ہیں جن سے اس کی کمپنی کی طرف سے زرداری کو دس ملین ڈالر کی رقم ادا کی گئی تھی اور یہ کہ اس کی ساکھ خراب کرنے کے لیے یہ چال چلی گئی ہے۔

ٹائمز کے مطابق سب سے پرکشش سودا جس کا پتہ ان کاغذات سے چلا ہے جس میں Dassault Aviation ملوث ہے۔ یہ ایک فرانسیسی ملٹری ٹھیکے والی فرم ہے جس نے پاکستان کو بتیس میراج 2005 لڑاکا طیارے خریدوانے میں مدد دی۔ فرم نے زرداری اور ایک پاکستانی ساجھے دار کو چار ملین ڈالر کے لڑاکا طیاروں کے سودے پر 200 ملین ڈالر کا کمیشن دینے کی پیش کش کی تھی۔ بے نظیر کی حکومت کی برطرفی کے ساتھ یہ سودا بھی ادھورا رہ گیا۔

ٹائمز نے انکشاف کیا ہے کہ بے نظیر کے قانونی مشیر شلنگیل لچ نے اپنی فائلوں کے لیے یادداشتی نوٹ لکھا تھا جس میں پیرس کے میں Champs- Elysees Dassault کے صدر مقام پر ہوئی گفتگو کا ذکر تھا۔ اس نوٹ کے مطابق کمپنی کے افسر اعلیٰ نے زرداری کی ملکیت میں چلنے والی آف شور کمپنی مارسٹون بزنس ایس اے کو پانچ فیصد کی اجرت کی پیش کش کی تھی۔ نوٹ میں اس جانب بھی اشارہ ہے کہ Dassault کے علاوہ دو اور کمپنیاں بھی رشوت پیش کریں گی جو میراج سازی کا کام کرتی ہیں۔ ایک کمپنی تھی Snecma جو انجن بناتی تھی اور دوسری کمپنی تھامسن سی ایس ایف تھی جو ہوا بازی سے متعلق برقی آلات تیار کرتی تھی۔

مجوزہ میراج طیاروں کو F_16 طیاروں کے دو اسکواڈرنوں کی جگہ لینی تھی جن کی خریداری پر اس وقت پابندی لگ گئی تھی جب 1990 میں بش انتظامیہ نے یہ رائے قائم کرلی تھی کہ پاکستان بالواسطہ طور پر نیوکلیائی ہتھیاروں کی تیاری میں لگا ہوا ہے۔ ٹائمز میں چھپی کہانی یہ اشارہ بھی دیتی ہے کہ پیرس میں مقیم بینکر اور وکیل عامر لودھی بھی جو برسوں امریکا میں بھی رہ چکا ہے اور جو امریکہ میں پاکستانی سفیر ملیحہ لودھی کا بھائی ہے اس سودے میں شریک ہے۔

بے نظیر اور زرداری نے ان داخلی معاہدوں سے بھی پیسہ کمایا جن کا مقصد دم توڑتی ہوئی معیشت کو جانبر کرنا تھا۔ ایک معاملہ جس کی تفصیل تفتیش کے دوران سامنے آئی یہ تھا کہ کسٹم میں ہونے والی خرد برد کو روکنے کے لئے ایک سوئس کمپنی کی خدمات حاصل کی گئی تھی۔ اس کمپنی نے 1994 سے 1996 تک زرداری اور نصرت بھٹو کے تسلط میں چلنے والی آف شور کمپنیوں کو کئی ملین کی رقم دے ڈالی تھی۔

بے نظیر کے پائدار دور حکومت میں عالمی مالیاتی فنڈ آئی ایم ایف کی طرف سے اس بات پر دباؤ پڑنے پر کہ بجٹ کے خسارے پر قابو پایا جائے اور ریونیو میں اضافہ

بھٹو فیملی کے غیر ملکی کھاتے میں جمع شدہ ایک سو ملین ڈالر کی رقم اور جائیدادوں کا پتہ چلا ہے اور یہ تو محض نمونہ ہے۔

کیا جائے۔ پاکستان نے تمام درآمدات کی پری شپ منٹ تصدیق کا کام دو کمپنیوں کو سونپا تھا جن کے نام ہیں سوسائٹی سیبریل دی سرویلینس ایس اے اور کوٹیکنا انسپکشن ایس اے لیکن بھٹو خاندان نے اسے بھی نرغے میں لے لیا۔ 1994 میں دونوں کمپنیوں نے زرداری اور نصرت بھٹو کی ملکیت دو سوئس آف شور کمپنیوں کو نو فیصد کمیشن دینے کا اقرار نامہ تحریر کیا۔

ان میں سے ایک کمپنی نے اپنے خط میں خاصا تیکھا لہجہ اختیار کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا اگر آج سے چھ ماہ کے اندر پاکستان میں درآمد شدہ اشیاء کے معائنے اور ان کی کمپنیوں کی تصدیق کا معاہدہ ہمیں وصول ہوجاتا ہے تو ہم انوائس پر دکھائی گئی اور حکومت پاکستان کو ادا کی گئی مجموعی رقم کا چھ فیصد اس معاہدے پر اور اس کی تجدید کے وقت ادا کریں گے۔ پاکستانی تفتیش کاروں کے مطابق دونوں سوئس کمپنیوں نے جنوری 1995 سے مارچ 1997 تک پاکستان میں 15.4 ملین ڈالر کی لاگت کی درآمدات کا معائنہ کیا اور 131 ملین ڈالر سے زیادہ کی کمائی کی۔

تفتیش کاروں کا اندازہ ہے کہ بھٹو خاندان کی کمپنیوں نے ان سودوں سے 11.8 ملین ڈالر حاصل کیے جس کا کم از کم ایک تہائی حصہ نواز شریف حکومت کے ہاتھ لگنے والے بینک کے حسابات میں ظاہر ہوا تھا۔ ▭

ایرانیوں کے ہاتھوں سے انقلاب کا دامن پھسلتا جا رہا ہے

نئے ایران میں شیطان بزرگ کے لیے اب وہ کراہیت باقی نہیں رہی

جن لوگوں نے 1979ء کے ایرانی انقلاب کا مشاہدہ کیا ہے انھیں اس بات کا خوب اندازہ ہوگا کہ خمینی کے ایران میں امریکہ اور دوسری استبدادی قوتوں کے خلاف کتنی نفرت پائی جاتی تھی۔ ایرانی بجاطور پر یہ سمجھتے تھے کہ امریکہ نے ایران کی پہلوی حکومت کو اپنا دست نگر بنا رکھا ہے۔ ایران کی دولت امریکی بینکوں میں منتقل ہورہی ہے۔ تیل کی دولت سے جو کچھ خریدا جارہا ہے وہ امریکی اسلحے جس کا بنیادی مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ ایران میں امریکہ کی حاشیہ نشیں حکومت کو استحکام ملتا رہے۔ اس کے علاوہ امریکہ سے جو کچھ درآمد ہورہا تھا وہ یا تو استعمال کی اشیاء تھیں یا پھر پوپ میوزک کا کیسیٹ۔ فیشن کے نئے انداز اور امریکی تہذیب کو سحر انگیز انداز سے پیش کرنے والے مظاہر: یہی وہ عوامل تھے جس نے پورے ایران کو امریکہ کی تہذیبی کالونی میں تبدیل کردیا تھا۔ ایران کے مسلم معاشرے پر مغرب نے کچھ اس انداز سے نقب لگائی تھی کہ دار الحکومت تہران کی سڑکوں پر چلتے ہوئے کسی کو اس بات کا احساس کم ہی ہوتا تھا کہ وہ کسی مسلم ملک میں موجود ہے۔ وہی ہاؤ ہو کے ہنگامے وہی رقص و سرود کا ماحول، منی اسکرٹ کی وہی ہنگامہ خیزیاں اور لہراتی زلفوں کی وہی فتنہ سامانیاں۔ گو کہ اسی ملک میں شیعہ مسلک کے اہم مذہبی ادارے بھی موجود تھے اور مساجد کے منبروں سے وعظ و تلقین کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن امریکی تہذیب نے کچھ اس انداز سے اپنا تسلط جمالیا تھا کہ نرے وعظ و تلقین سے صورت حال کو قابو میں کرنا ممکن نہ تھا۔



عین اسی لمحے جب ملک میں انقلاب کا خمیر تیار ہوچکا تھا، علماء کے ایک گروہ نے بڑی چابکدستی سے انقلاب پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ فروری 79 میں جب خمینی کی ایران واپسی ہوئی تو ملک بھر میں ان کی کرشماتی اور طلسماتی شخصیت کے لیے وہ غلغلہ بلند ہوا جس کی نظیر قریبی تاریخ میں نہیں ملتی۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ بہت تھوڑے عرصے میں خمینی اور ان کے ساتھیوں نے ایران سے امریکی تہذیب کے تسلط کو

دیس نکالا دیا۔ مغربی تہذیب پر زور و شور سے لعن طعن شروع ہوئی کہ اس تہذیب کا ہر مظہر قابل ملامت تصور کیا جانے لگا۔ امریکہ شیطان بزرگ قرار دیا گیا اور ملک بھر میں اٹھتے بیٹھتے "مرگ بر امریکہ" کے نعرے لگائے گئے اور ہر اس چیز کا جس کا تعلق امریکہ سے تھا اس کے لیے ایرانیوں کے دل میں کراہیت کا جذبہ بیدار کیا گیا۔ عوام کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ اپنی اسلامی تہذیب کے سلسلے میں فخر و اعتماد کا انداز اختیار کریں۔

انقلابی قیادت کے امریکہ مخالف رویے سے اتنا تو ضرور ہوا کہ ایرانیوں کو اپنی تہذیب پر ٹیک لگانے کا سلیقہ ہاتھ آگیا اور جس اجنبی تہذیب کی یلغار سے ان کا معاشرہ شکست و ریخت کے عمل سے دوچار تھا۔ اس پر یکسر بند بندھ گیا۔ پھر ایرانیوں کے اندر یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ ان کا تعلق ایک بڑی امت سے ہے اگر وہ چاہیں تو یہ سب کچھ من حیث القوم ان کے عالمی غلبے کے لئے کافی ہوسکتا ہے لہذا تاریخ میں پہلی بار ایران کے شیعہ لیڈروں نے سنی دنیا کی طرف دست التفات بڑھایا اور اس بات کی کوشش کی کہ امریکہ اور دوسری استعماری قوتوں کے مقابلے میں مسلمان اپنے سارے گروہی اختلاف بھلاکر ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کھڑے ہوسکیں۔

تاریخ میں پہلی بار ایران کے شیعہ لیڈروں نے سنی دنیا کی طرف دست التفات بڑھایا اور اس بات کی کوشش کی کہ امریکہ اور دوسری استعماری قووتوں کے مقابلے میں مسلمان اپنے سارے گروہی احتلاف بھلاکر ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کھڑے ہوسکیں۔

ابتداء میں اس رویے کو عام سنی دنیا سے پذیرائی بھی ملی البتہ جب خود ایران کے اندر تشیع نے شدت اختیار کرلی تو باہر کی دنیا سے ایران کا رابطہ کمزور ہوتا گیا۔

ایرانی انقلاب کو سہارنے کے لیے قائد انقلاب آیت اللہ خمینی نے ہر اس علامت کا استعمال کیا جو ایرانیوں کو مغرب کے کیمپ سے ہٹاکر اسلامی کیمپ میں ڈالنے میں معاون ہوسکتا تھا۔ حج کے موقعوں پر امریکہ اور روس کے خلاف نعرے لگوائے گئے۔ ملک کے اندر امریکی سفارت خانے میں اسلام مخالف سازشوں کا پتہ لگاکر امریکیوں کو سرے عام رسوا کیا گیا اور مغربی ملکوں کی سخت مخالفت کے باوجود ناموس رسول کی حفاظت کے واسطے سلمان رشدی کے خلاف موت کا فتوی جاری کیا گیا۔ خمینی کو اس بات کا احساس تھا کہ جب تک اسلام دشمن قوتوں کے خلاف ایرانی قوم ڈٹی رہے گی اس وقت تک انقلاب کے ثمرات کو ضائع کرنا آسان نہ ہوگا اس لیے ساری دنیا کی مخالفت کے باوجود انھوں نے بستر مرگ پر بھی رشدی کی موت کے فتوی کو منسوخ نہیں کیا۔ دنیا سے جاتے جاتے انھیں بات سے شدید قلق تھا کہ ان کے شاگردوں میں، جو اب نئی حکومت کی زمام کار سنبھالے ہوئے تھے، مغرب کے سلسلے میں نرم گوشہ پیدا ہونے لگا ہے اور وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ جدید دنیا میں ایران کی خوشحالی کے لیے یہ ضروری ہے کہ مغرب کی طرف سخت رویے کو ترک کردیا جائے۔ اپنی وفات سے کچھ پہلے آیت اللہ خمینی نے ایک نظم میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ اب جب وہ اس دنیا سے جارہے ہیں ایران کی موجودہ صورت حال سے خوش نہیں ہیں۔ ان کے بقول مساجد اور مدرسہ ویران ہے۔ اس آواز سے خالی جسے سننے کے لیے انھوں نے اپنی پوری زندگی جانگسل جدو جہد میں گزاری۔ آج جب چل چلاؤ کا وقت ہے ایک ایسا شخص نظر نہیں آتا جو اس انقلاب کی قیادت کا اہل ہو۔ خمینی بستر مرگ پر یہ محسوس کررہے تھے کہ مصلحت نے جرات پر قابو پالیا ہے۔ لوگوں کا دل آسمانوں پر ٹکنے کے بجائے نفع و نقصان کے میزانیے میں مصروف ہے۔

تب سے اب تک ایرانی قیادت نے جو سفر طے کیا ہے وہ جرات سے مصلحت تک کا سفر ہے۔ جب خمینی نے رشدی کی موت کے لیے فتوی جاری کیا تھا اور جس کے نتیجے میں مغرب کے بیشتر ممالک نے اپنے سفارتی عملے کو ایران سے بلوالیا تھا اس وقت خمینی کو یہ اطمنان تھا کہ دنیا ناراض ہوجائے۔ لوگ ملک چھوڑ جائیں تو کچھ پرواہ نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت ہمارے دلوں میں باقی رہ گئی تو بس وہ کافی ہے۔ کل تک نفع اور نقصان کا میزانیہ نظریاتی بنیادوں پر کیا جاتا تھا۔ آج صورت حال خاصی بدل چکی ہے۔ خاتمی کی قیادت میں جرأت سے مصلحت تک کا سفر اچانک تیز ہوگیا ہے۔ اب ہر مسئلہ کو اِس انداز سے دیکھا جارہا ہے کہ اس میں معاشی خوشحالی کے امکانات کس قدر ہیں۔ ایرانیوں کے اندر اس خیال نے بھی اپنی جگہ بنالی ہے کہ مغرب سے خوشگوار تعلقات رکھے بغیر وہ فلاح و کامرانی سے ہمکنار نہیں ہوسکتے۔ جب خوشحالی ہی کسی نظری ریاست کا اولین ایجنڈا بن جائے تو پھر نظریاتی ایجنڈے رفتہ رفتہ پیچھے چلے جاتے ہیں لہذا ایران کی نئی قیادت گذشتہ چند ماہ سے ہر وہ ممکن کوشش کررہی ہے جس سے ایران کو مغرب کے لیے قابل قبول بنایا جاسکے۔ ابھی گذشتہ دنوں ایران میں بعض موقعوں پر دوسرے ممالک کے جھنڈوں کے ساتھ امریکی جھنڈا بھی لہراتا دکھائی دیا جس سے شاید ایرانی حکومت کو یہ باور کرانا مقصود ہے کہ اب ایران میں امریکہ کے لیے وہ کراہیت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس کے علاوہ ملک میں بعض ایسی فلمیں بھی دکھائی جارہی ہیں جس سے امریکی ثقافت کو معتبر ٹھہرانا مقصود ہے گو کہ بعض ایسی فلموں پر ایران میں ہنگامے بھی ہوئے ہیں لیکن اس قسم کی فلموں کی اجازت دینے سے اس بات کا واضح اشارہ ملتا ہے کہ حکومت امریکہ کے لیے لوگوں کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا کررہی ہے۔ The Snowman نامی ایک فلم میں ایک ایسے ایرانی کی تصویر کشی کی گئی ہے جو امریکہ جانے کے لیے اس قدر بیتاب ہے کہ وہ ویزا کے حصول کے لیے خود کو ایک

عورت کے بھیس میں پیش کرتا ہے اس کے علاوہ ایسی فلمیں بھی دکھائی جارہی ہیں جس میں نسوانی کردار اب حجاب کی پہلے کی سی پابندی نہیں کرتے۔ کھیل کے میدان میں اور فٹ بال کے میچوں میں اب کھلاڑیوں کی توجہ نماز کی پابندی سے کہیں زیادہ میچ کے جیتنے پر ہوتی ہے۔ گویا ہر سطح پر معاشرے میں نظریاتی زوال نے سر ابھارا ہے۔ ایرانیوں کو فروری 79ء کے انقلاب سے کہیں زیادہ اب نومبر 97 کا فٹ بال انقلاب یاد ہے جب تنے ایران نے پہلی بار عالمی کپ میں حصہ لینے کی ٹھانی۔ کہا جاتا ہے کہ نومبر میں جب ایران کی ٹیم کو فتح ملی تو ایرانی کچھ ایسے پاگل ہوئے کہ ملک بھر میں ہاؤ ہو کا ہنگامہ برپا ہوگیا۔ گھر کی چھتوں سے لوگوں نے روپیوں کی بارش شروع کردی۔ بعض گل فروشوں نے مارے خوشی میں آکر اپنے سارے پھول مفت تقسیم کردیئے اور بعض حلوائیوں نے جوش میں اپنی پوری دکان راہگیروں کو تقسیم کردی۔ لوگ بسوں کی چھتوں پر رقص کرتے نظر آئے۔ یہاں تک کہ مردوں اور عورتوں کا اختلاط بھی کھلے عام دیکھنے میں آیا۔ بعض عورتوں نے اپنی چادریں پھینک دیں اور لہراتی زلفوں کا منظر بھی کھلے عام دکھائی دیا۔ اس صورت حال پر مذہبی پولیس بھی قابو نہ پاسکی۔ ایسا نہیں کہ یہ سب کچھ اچانک ہوگیا ہو بلکہ کھیل کے بعد جب ایرانی ٹیم آسٹریلیا سے واپس آئی تو دوبارہ کچھ اسی قسم کا منظر دیکھنے میں آیا۔ ایسا لگتا ہے کہ ایران کی نئی قیادت موہوم خوش حالی کی تلاش میں دوبارہ اسی راستے جانکلی ہے جو پرانے ایران کو جاتا ہے۔ تو کیا صدر خاتمی ایران کے لیے گورباچوف تو ثابت نہیں ہوں گے، جن کے ہاتھوں خمینی کے ایران کا خاتمہ انجام پائے گا؟ قرائن تو بتاتے ہیں کہ ریاستی پالیسی اسی راستے پر گامزن ہے۔ ڈش انٹینا کے ذریعے ملک میں فحاشی کا سیلاب امڈا آتا ہے اور اس صورت حال پر حکومت نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ ایک طرف تو انقلاب کی حفاظت کا دعوی ہے اور دوسری طرف وہ سب کچھ کیا جارہا ہے جس سے ایرانی انقلاب خود بخود تحلیل ہوجائے۔ خمینی کے شیدائیوں کو اب اگر امید ہے تو صرف آیت اللہ خامنی کی ذات سے جو اب بھی ہر لمحہ انقلابی اثاثے کو سنبھالنے میں سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ ابھی یہ کہا جانا مشکل ہے کہ ریاستی پالیسیوں کے مقابلے میں خامنی کس حد تک مؤثر ثابت ہوسکتے ہیں۔ ▭

جدیدیت دراصل کفر کا دوسرا نام ہے

مغرب زدہ بیمار مسلم ذہن سے لندن کے ایک انقلابی مسلم جریدے کا خطاب

اسلام اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر اب یہ قابل عمل رہا ہے اور روز قیامت تک تمام انسانوں کو فیض پہنچاتا رہے گا۔ تاہم ایک ایسے دور میں ہم جی رہے ہیں جو گہری تشکیک سے عبارت ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں لوگ ہزار بار دہرائے ہوئے طریقوں اور حقائق پر تو اعتبار کرتے ہیں لیکن خود اپنی حقیقت تک ان کی نظریں نہیں جاتیں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی الوہی حقیقت کی اہمیت کا انہیں احساس نہیں ہوتا۔ آج کا تشکیک زدہ انسان سوال کرتا ہے کہ چودہ سو سال پہلے نافذ کردہ ضابطہ حیات کا نفاذ آج کیسے ممکن ہے؟ کیونکہ انسانوں نے بہت ترقی کرلی ہے اور اس وقت سے ہماری زندگیوں میں حیرت انگیز تبدیلیاں واقع ہوچکی ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی کے عربوں کو ہمارے آلات پیداوار حرفت، تجارتی ذرائع اور مواصلاتی طریقوں کا کوئی علم ہی نہ تھا

اس سے قطع نظر کہ اسلام کے بارے میں کوئی کیا کہتا ہے بحیثیت مسلمان کے ہمارا ایمان یہ ہونا چاہئے کہ ہماری آج کی زندگی پر اسلام کا نفاذ ہوسکتا ہے اور اس کی معنویت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی چودہ سو سال پہلے تھی۔ ہمیں اس کا یقین ہونا چاہئے کہ اگر ہم حقیقی اسلام پر عمل کریں گے تو ہم دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی سے سرفراز ہوں گے۔ بلکہ ہمیں ان حالات پر فخر ہونا چاہئے جن کا انتخاب اللہ نے نور ہدایت کے نزول کے لئے انتخاب کیا۔

> اسلام کے بارے میں کوئی کہتا ہے بحیثیت مسلمان کے ہمارا ایمان یہ ہونا چاہئے کہ ہماری آج کی زندگی پر اسلام کا نفاذ ہوسکتا ہے اور اس کی معنویت آج بھی اتنی ہی ہے جتنی چودہ سال پہلے تھی۔

التباس پسندوں کی کہی ہوئی باتیں اب گورکھ دھندہ نہیں رہ گئی ہیں بلکہ اب انہیں نئے معنی دئے گئے ہیں۔ اس کلی ماؤس اور کھیلو اور پھینکو کھلونوں والی سوسائٹی کو ہر اس شے کا جنون ہے جو نئی اور ماڈرن ہو۔ جو ہتھکنڈے پہلے صابن بیچنے کے لئے استعمال ہوتے تھے وہی اب خیالات کی فروخت کے لئے بھی کام میں لائے جارہے ہیں۔ یہ خیالات زندگی، تہذیب، سماج اور

سیاست سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیا واقعی نئے کا مطلب "بہتر" ہے۔ محض اس لئے کہ ہمارے سامنے اس کی بار بار تکرار کی جاتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ ہر نئی چیز حقیقی بھی ہے۔ لندن کے کسی پرہجوم بازار سے عمدہ ترین کار میں بیٹھ کر گزرے تو اس کی اوسط رفتار قرون وسطی میں گھوڑے کی سواری کی رفتار سے زیادہ نہیں نکلے گی۔ یہ مثال ذرا غیر سنجیدہ معلوم ہوگی لیکن اسلام پر انگشت نمائی کرنے سے پہلے جدیدیت پر حرف گیری کرنی چاہیے۔

انسانی زندگی کی پیچیدگیوں اور فرقہ واریت نے ہمیں حیرت زدہ کر رکھا ہے۔ اگر ہمیں یہ جائزہ لینا ہو کہ ہم کیا ہیں اور کیسے جیتے ہیں تو یہ معلوم ہوگا کہ بعض بنیادی باتیں اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ ہماری بعض نامیاتی ضروریات اور جبلتیں ایسی ہیں جو کبھی نہ بدلی ہیں اور نہ بدلیں گی۔ روئے زمین پر پیدا ہونے والے پہلے انسان کو غذا، پانی ہوا اور سانس کی ضرورت پیش آئی تھی۔ اس کے بعد سے یہ چیزیں ہر انسان کی بنیادی ضروریات بن گئیں۔ غذا کی مقدار کے بارے میں اسلام نے بعض ضابطوں کا انکشاف کیا۔ چونکہ ہماری غذا کی ضرورت بدستور قائم ہے ان قوانین کی پیروی آج بھی ہونی چاہیے۔ بیسویں صدی کے طرز زندگی نے مسلمانوں کو اسلام کے بتائے ہوئے غذائی اصولوں کی تکمیل سے تو نہیں روکا ہے۔

کیا اسلام کا نفاذ آج ممکن ہے

اللہ نے مردوں کے لئے سونا پہننا ممنوع قرار دیا ہے جو سنت نبوی سے ثابت ہے۔ اس قانون کا سمجھنا، اس کا نافذ کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا ہمارے لئے آج اتنا ہی ممکن ہے جتنا چھٹی صدی عیسوی میں تھا۔ قرآن نے شراب نوشی سے منع کیا ہے اور جس سیاق میں یہ ممانعت آئی وہ کھجور، انگور اور شیرے سے تیار کئے گئے سیال سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنی اصل، شکل، بو، رنگ اور غالباً ذائقے میں جانی واکر وہسکی اور جاہلیت کے عربوں کے اس مشروب سے یکسر مختلف ہو، کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہسکی پینا اسلام میں ممنوع نہیں بلکہ یہ انگور سے کشید کی گئی شراب کی طرح ہی حرام ہے۔ دماغ پر دھندلاہٹ کرنے کی صلاحیت وہسکی اور انگور کی شراب دونوں میں مشترک ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ "خمر" کے حکم کی توسیع بعد کے زمانوں میں لوگوں کے استعمال میں آنے والی چیزوں پر ہورہا ہے۔ (TMQ 62:9)

جمعہ کی نماز کے سلسلے میں خرید و فروخت چھوڑ کر نماز کی طرف دوڑنے کا حکم دینے والی آیات پر عہد نبوی سے آج تک اربوں مسلمان عمل پیرا ہیں۔ اس آیت میں اللہ نے جو قانون اتارا ہے وہ یہ ہے کہ جمعہ کی نماز کے وقت عاقل و بالغ مسلمان مرد کے لئے خرید و فروخت میں مصروف رہنا منع ہے۔ اور لفظ "بیع" پر خاص تاکید ہے۔ تاہم ممانعت صرف خرید و فروخت کی ہی نہیں سمجھی جائے گی بلکہ یہ کہ اس وقت ایک مسلمان کو خود کو کسی بھی چیز میں مصروف کرنا یا الجھانا نہیں چاہیے۔ خود کو مصروف کرنے کا جو مفہوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا وہی آج بھی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی کبھی واقع نہیں ہوئی اور نہ ہوگی۔ فلم و اخبار بینی، کھانا پکانا اور سونا سب کچھ اسی کے دائرے میں آجاتا ہے۔ اگرچہ ان باتوں کا تعلق بیع یا خرید و فروخت سے نہیں ہے لیکن یہ سب جمعہ کے وقت ممنوع ہیں۔ اسلامی قوانین کے متون کو پڑھنا اور آج کی زندگی پر ان کے نفاذ کے طریقے تلاش کرنا بذات خود ایک علم ہے۔ تاہم یہ ایسا علم ہے جس پر ہم سب کا اعتماد اور یقین شرط ہے۔ ایک اور مثال اس آیت کی ہے جو جنگ کے بارے میں نازل ہوئی جس میں اپنی طاقت کو مجتمع رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ (TMQ 48:60)

اللہ نے اس امت کو ذہین علماء اور دانشور عطا کئے ہیں جو قرآن و سنت سے قوانین و ضوابط کا استنباط کرسکتے ہیں۔ اپنی حالت کو بہتر کرنے کے لئے لازم ہے کہ ہم ان قوانین کا اطلاق اپنی زندگیوں پر کریں۔

اس قانون میں یہ اصول کارفرما ہے کہ مسلمانوں کو جنگ کے لئے خود کو تیار رکھنا چاہیے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بندوق کے گھوڑے کھلے رکھے جائیں بلکہ تیاری اس طرح کی ہو کہ جسے دیکھ کر دشمن پر ہیبت چھا جائے۔ ظاہر ہے کہ وقت کی ترقی اور حالات اور مقام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ جنگ میں استعمال ہونے والے ہتھیاروں اور اسلحوں کی نوعیت بدلتی جائے گی۔ لیکن مستعد رہنے اور دشمن کو خوف زدہ کرنے کا اصول وہی رہے گا۔ آیت کی تفصیل میں جائیے تو جنگی گھوڑوں کا ذکر ملے گا کیونکہ وہ اس زمانے کی مہلک مشینوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس دور میں دشمنان اسلام کو خوف زدہ کرنے کے لئے بالسٹک میزائل بنائے جاسکتے ہیں اور اس طرح اسلامی ریاست پر جنگ کے لئے تیار رہنا لازم ہوجاتا ہے۔

خمار کی کیفیت، جمعہ کی مناسبت خود کو مصروف رکھنے اور جنگ کے لئے مستعد رہنے کے اصولوں کے مضمرات بنیادی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے کبھی تبدیل نہیں ہوئے۔ ان کی فروعات میں ضرور تبدیلی ہوئی ہے لیکن اصل اپنی جگہ اسی طرح قائم ہے جیسے پہلے تھی۔ اللہ نے اس امت کو ذہین علماء اور دانشور عطا کئے ہیں جو قرآن و سنت سے قوانین و ضوابط کا استنباط کرسکتے ہیں۔ اپنی حالت کو بہتر کرنے کے لئے لازم ہے کہ ہم ان قوانین کا اطلاق اپنی زندگیوں پر کریں۔

اسلامی ریاست کو بقا کی ضمانت اور طاقت صرف حکومت کے اختیار و اقتدار

کے حاصل ہونے والی نہیں ہے بلکہ شہریوں کو اسلام پر اپنے عقیدے اور اعتماد کو پختہ کرنا ہوگا۔ یہ اعتماد نہ صرف اس زندگی اور آخرت کی زندگی میں ہماری مدد کرے گا بلکہ اسلام کے ایک وحدت کی حیثیت سے نفاذ میں بھی معاون ثابت ہوگا۔ ہم میں مغربی پروپیگنڈہ کو نظرانداز اور جدید فلسفے کو مسترد کرنے کا حوصلہ ہونا چاہیئے۔

دور حاضر کے لئے اسلام کے ماخذ سے رجوع کرنے کا اصول سرمایہ داری کے اصول سے متضاد ہے۔ یہ فلسفہ کہ نئی چیز اچھی ہوتی ہے سرمایہ دار قوموں میں جدت کی ناقابل تسکین ضرورت پیدا کر رہا ہے ہے سرمایہ داری کو ہوا دینے والے اصول وہی ہیں جو صارفیت کو فروغ دے رہے ہیں۔ لہٰذا مسلمان، سرمایہ داری صارفیت اور سیکولر فلسفہ کو باہم مربوط سمجھیں اور یہ سب اسلام کے لئے اجنبی اور اس کے مخالف ہیں۔ بیجا نہ ہوگا اگر ہم یہ سوال کریں کہ یہ رحجانات آخر مسلمانوں میں کیونکر مقبول ہو رہے ہیں۔ ان تصورات نے مسلم ممالک میں راتوں رات اپنی جگہ نہیں بنائی ہے بلکہ امت کے جسم میں ان کا نفوذ سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا گیا ہے۔

جدیدیت کی نقاب میں کفر

مسلمانوں کے ذہنوں میں سیکولرازم کے اصول کو جاگزیں کرنے کی غرض سے جدیدیت کو نقاب کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ معاملات زندگی سے احترام و اخلاص کی علیحدگی سیکولرزم ہے۔ ایک بہتر تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ سیکولرزم اسلام کو مکمل ضابطہ حیات سے بدل کر نمائش بنا دینے کا نام ہے۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مغربی طاقتوں کو فوجی ذرائع سے اسلام کو شکست دینا بہت دشوار نظر آیا اس لئے انہوں نے بالواسطہ طریقے اختیار کئے۔ مشنری، اسکول، پریس، پروپیگنڈہ لٹریچر یہ سب چیزیں اسلام کے خلاف مغرب کا اسلحہ ہیں۔ تاہم ان کا ایک اہم کام اسلام کو اندر سے کھوکھلا کرنا تھا۔ کیونکہ اس کا اثر یونیورسٹیوں اور دیگر تعلیمی اداروں کے واسطے سے مسلمانوں پر پڑتا تھا۔ ان کوششوں کا مجموعی نتیجہ جدید مکاتب فکر کا قیام تھا۔ ان میں سے نمایاں مکاتب کی سربراہی جمال الدین افغانی، محمد عبدہ اور رشید رضا مصری نے کی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے اب تک انسانی معاشرے نے بہت ترقی کی ہے اور حالات حد درجہ تبدیل ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بار رشید رضا نے اسلامی ریاست کے سربراہ کو پوپ کا ہم رتبہ قرار دیا ہے۔ اس طرح کے بیانات کا مقصد مسلمانوں کو یہ باور کرانا ہے کہ قدیم پر جدید کو اسی طرح ترجیح دی جانی چاہیئے جس طرح مغرب نے پوپ کی جگہ پارلیمنٹ کو لا رکھا۔ اسی طرح جدیدیت کے تصور کے پس پردہ مسلمسانوں کو نئی جمہوری بد عنوانی کو قبول کرنے پر آمادہ کرنا تھا جو اپنے دامن میں شخصی آزادی، انسانی حقوق اور کھلے بازار جیسی علتیں لئے ہے ہے۔

اور اسلامی ممالک میں جدیدیت

جدیدیت کے داعیوں کو گذرے اگرچہ عرصہ ہوا لیکن ان کے خیالات آج بھی دنیائے اسلام میں مقبول ہیں۔ یہ خیالات اپنی اصل شکل میں بھی مل جائیں گے اور ترقی یافتہ شکل میں بھی کیونکہ ان جدیدیت کے بانیوں نے دوسری نسل کے دانشوروں کی پوری ایک کھیپ تیار کردی تھی جو اسلام کے سرکاری ترجمان بنے رہے ہیں۔ آج ہم محمد عبدہ کے نسل کی لوگوں کو بد عنوان حکومتوں کے مشیروں، یونیورسٹیوں میں صدور شعبہ جات اور سرکاری مسجدوں میں امام کے مناصب پر فائز دیکھ رہے ہیں۔ آج وہ ماضی میں زندہ رہنے والے لوگوں کو اس کی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ نئی اقوام متحدہ اور عالمی بینک کا استقبال کریں۔ وہ عصر حاضر میں مسلمانوں کی اسلام سے واقفیت کو کمتر کرنے اور اس پر ان کے اعتماد کو کمزور کرنے کے لئے برابر کوشش کر رہے ہیں۔

> اسلام نہ تو صرف بنی اسائیل کے لئے آیا تھا نہ اہل روم یا اہل فارس کے لئے۔ نہ اس کے نزول منشا چھٹی صدی عیسوی کے باد یہ نشینیوں کی ہدایت تھا بلکہ یہ محمدؐ بن عبداللہ کے وقت سے رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لئے نور ہدایت بن کر اترا ہے۔

اسلام پر ایمان و یقین کو بہالے جانے کی کوشش محض اصولوں تک ہی محدود نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ عورتوں کو حجاب میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ معاشرہ اب اس ضرورت سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ کچھ اور لوگ یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ پانچ وقت نماز ادا کرنے کی بات اب معقول نہیں لگتی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زمانے کے مقابلے میں موجودہ دور کی زندگی زیادہ تیز رفتار ہے یا یہ کہ روزہ ماضی میں ہی عملاً ممکن تھا جب انفارمیشن ٹیکنولوجی کے امتحان کے پرچے کی تیاری کا بوجھ اٹھانا نہیں پڑتا تھا۔ واقعی نئی دنیا کی دوڑ میں لوگوں نے اسلام کو پامال کر ڈالا ہے۔ اس طرح وہ Simulahed طریقے سے حج کرنے کے لئے ورچوال اٹلی کعبہ کی تجویز رکھ دیں گے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام نہ تو صرف بنی اسرائیل کے لئے آیا تھا نہ اہل روم یا اہل فارس کے لئے۔ نہ اس کے نزول کا منشا چھٹی صدی عیسوی کے بادیہ نشینوں کی ہدایت تھا بلکہ یہ محمد بن عبداللہ کے وقت سے رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لئے نور ہدایت بن کر اترا ہے۔ اس پر مسلمانوں کو یقین ہے اور ان کا ایمان اس پر ہے کہ اللہ کی ہدایت کا نفاذ دنیا پر صحیح طریقے سے ہوگا۔ ▭

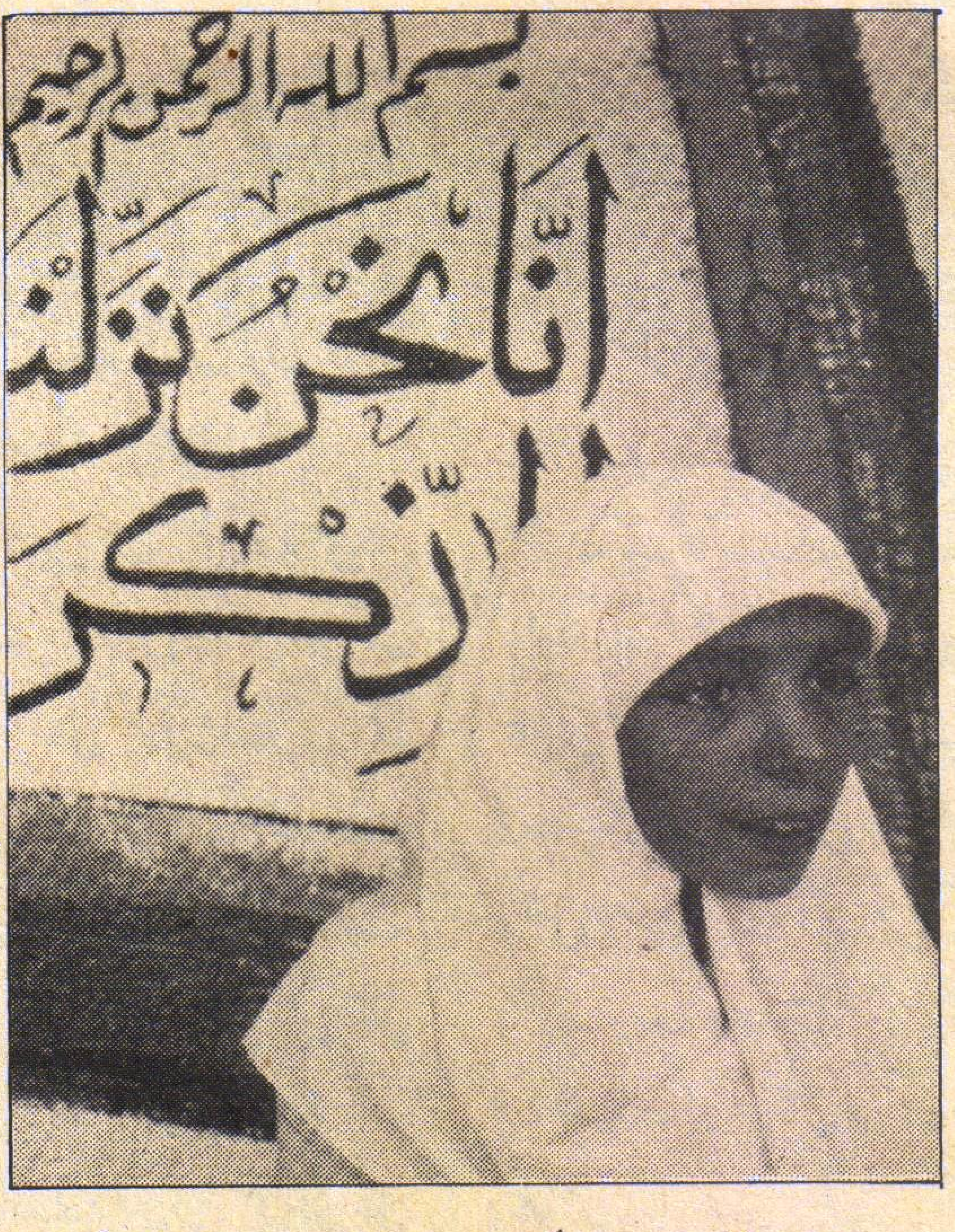
چینی مسلمان: جن کے خاکستر میں ہے اب بھی شرار آرزو

یوغیر مسلم تحریک سے اب چینی نظامِ جبر کی بنیادیں ہلنے لگیں

ترجمہ: س احمد

سات سات سال پہلے چین کے یوغیر مسلمانوں نے ہلکی سطح پر زن جیانگ میں بغاوت کا آغاز کیا تھا وہ آج بمباری اور قتل و غارت گری کی دہشت گردانہ تحریک بن چکی ہے۔ بیجنگ نے اس کا جواب پھانسی، جیل بھرنے اور یہاں تک کہ ہان چینی تارکین وطن کی آباد کاری جیسے اقدامات سے ہے اب یہ باغی عناصر جہاد کی آواز بلند کر رہے ہیں اس سلسلے میں پیش ہے ایک چشم دید رپورٹ

ایک پرہجوم لنچ ٹائم کینٹے میں خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف سانولے چہرے والے شرمیلے شخص کی طرف دیکھ کر کچھ اس طرح کے توہین آمیز کلمات کہے جا رہے ہیں۔ بھگاؤ، چوہے کی طرح رگڑ دو، کیڑے کی طرح مسل دو۔ کیا یہ آدمی ایسا خطرناک اور دہشت گرد ہو سکتا ہے جس سے سمجھوتہ ممکن نہیں۔ چین کی سیکورٹی اور خفیہ ایجنسی سے متعلق افراد کا کچھ ایسا ہی خیال ہے جو بیس سال سے اسے تفتیشی مراکز، جیلوں اور تادیب گاہوں کی خاک چھنواتے رہے ہیں اور اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے اور اس جیسے نہ جانے کتنے افراد سے اس طرح حساب برابر کیا جاتا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ شخص دہشت گرد ہے یا مجاہد آزادی۔ مثال کے طور پر ترغن نسلی اعتبار سے یوغیر ہے اور ایک بظاہر بے امید اور ہلاکت خیز مقصد سے وفاداری کو شعار بنائے ہوئے ہے اور وہ مقصد ہے زنجیانگ کے ان مغربی علاقے سے طاقتور چینی اقتدار کو باہر نکال پھینکنے کا جسے ترغن اور اس کے ساتھی مشرقی ترکستان کہنا پسند کرتے ہیں۔ ترغن ابھی اپنے مقصد سے بہت دور ہے اور وہ خود مسکراہٹ کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ اس کے کامیابی کے امکانات ابھی صفر کے برابر ہیں۔ تاہم اس نے اور اس کے علیحدگی پسند ساتھیوں نے چینی اقتدار کو شکنجے میں ضرور لیا ہے۔ گزشتہ دہائی کے دوران زنجیانگ کے وقتی اضطرابات نے دہشت کی پوری طرح اٹھتی ہوئی لہر کی شکل اختیار کر لی ہے جو کہ ثقافتی انقلاب کے وقت سے چین کے داخلی نظم و ضبط کے لئے سنگین ترین مسئلہ بن گیا ہے۔ منظم پیمانے پر بمباری اور قتل و غارت نے چینی ذمہ داران کو اجتماعی گرفتاری اور ہیبت ناک سزاؤں کا طریقہ اختیار کرنے پر اکسایا ہے جس کا ثبوت پچھلے دنوں شدید فسادات کے بعد کئی روز کے لئے Yinneng قصبے کو آمد و رفت کے لئے ممنوع کر دینے کا فیصلہ ہے اور یہ اس طرف اشارہ ہے کہ چین میں بے اطمینانی کی صورت حال چند عناصر ہی تک محدود ہے بلکہ یہ زندگی کا ایک عام مظہر بن گیا ہے۔



ترغن نے ذاتی طور پر بم داغنے کی کسی کارروائی میں اپنی شرکت کا اعتراف نہیں کیا ہے۔ لیکن وہ واضح طور پر یوغیر کی زیر زمین دنیا کے بارے میں اتنا جانتا ہے جو چین کے اچھے ذہین لوگ بھی نہ جانتے ہوں گے۔ اور اسی لئے اس نے احتیاط کے طور پر ملک چھوڑ دیا ہے۔

ترغن اور اس کے ساتھیوں سے ملنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لئے کافی ہاؤسوں اور ہوٹلوں میں گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے اور پھر بھی مایوسی ہی ہاتھ آتی ہے ترغن کو اس کی دادی نے بچپن میں ہی بتایا تھا کہ مسلمان بے دین لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں اور پہلی بار اس نے یہ بھی جانا تھا کہ ہان چینی باشندے یوغیروں کو نفرت سے دیکھتے ہیں اور تبھی سے وہ خود کو ہان چینیوں کے خلاف آراستہ کرنے لگا تھا۔ چینی حکام سے اس نے پہلی بار اس وقت پنجہ لڑایا جب وہ عمر کی دوسری دہائی میں ہی تھا اور اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک پولیس

اسٹیشن سے اسٹین گن چرانے کی کوشش کی تھی۔ ایک کلاشنکوف اور ایک مشین گن اس کے ہاتھ لگی تھی جن سے وہ چینیوں سے لڑنے کا خواہشمند تھا۔ اس ابتدائی کوشش نے جس کی بدولت وہ جیل میں ڈالا گیا اسے چین مخالف سرگرمیوں میں ماخوذ ایک امام سے متعارف کرایا گیا جنہوں نے اسلام پر ترغن کے یقین کو پختہ کیا اور جو آج بھی اس کے لئے سرمایہ حیات ہے اور وہ اسے اپنی قوت تصور کرتا بلکہ اس مقام تک لانے کے لئے وہ چینیوں کا شکر گزار بھی ہے۔

1990ء میں ترغن ایک زیر زمین تنظیم سے وابستہ ہوا جس کی قیادت ایک طالب علم زاہد بن یوسف کے ہاتھ میں تھی جو کاشغر کے جنوب میں واقع ایک یوغیری قریے کا باشندہ تھا جہاں ایک عرصے تک چین مخالف اضطراب شدت پر تھا۔ منافق حملہ آوروں کے مقابل میں مصروف جہاد افغانیوں سے تحریک حاصل کرتے ہوئے زاہد بن یوسف نے نوجوانوں کا ایک گروہ تیار کیا اور اس کے بعد اسلحہ جمع کرنے میں لگ گیا۔ "بارن" نام کا یہ نو تنظیم شدہ گروہ پورے ترکستان میں پھیل گیا اور اس کے ممبران نے لوگوں کو جہاد کی ترغیب دینی شروع کی۔ پہلے تو خود ترغن کا خیال تھا کہ ابھی اس کا مناسب وقت نہیں آیا ہے۔

تاہم اس کی پروا کئے بغیر بارن نے اپریل 1990ء میں حملہ بول دیا جس میں زاہد بن یوسف اور تیس دیگر افراد مارے گئے۔ ان کے ہمدردوں اور حامیوں کی ایک بڑی تعداد نے ہیلی کاپٹر پر سوار فوجوں کی تفتیش سے بچنے کے لئے پہاڑیوں میں جگہ جگہ پناہ ڈھونڈی۔ کافی لوگ گرفتار ہوئے اور ترغن بھی ایک ہزار مشکوک گرفتار شدگان میں تھا۔ پہلی بار کسی علاقہ گیر اسلامی تنظیم نے چینی حکومت کو چیلنج کیا تھا۔

"بارن" گروہ کی یورش تو ایک ابتدا تھی۔ چینیوں تک ترغن کو ارمقی میں ایک جگہ بند کرکے پوچھ گچھ ہوتی رہی اور پھر اسے اصلاح کی غرض سے کئی سال تک کے لئے محنت کشوں کے کیمپ میں ڈال دیا گیا۔ تاہم اسلامی علیحدگی پسندوں کی کمر توڑ دینے کا چینی حکام کا خیال باطل ثابت ہوا۔ کیونکہ بے شک کافی لوگ گرفتار ہوئے اور ایسے بھی تھے جنہوں نے "بارن" سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی لیکن تنظیم کے لئے خفیہ طور پر کام کرتے رہنے والے افراد بھی موجود تھے۔ فروری 1992ء میں اتفاق سے دو بم چینی سال نو کے موقع پر ارمقی کی ایک بس میں پھٹے جس میں چھ افراد ہلاک ہوئے۔ اس کا مطلب یہ کہ بارن کی جدوجہد کا آغاز کرنے والوں کی ہمتیں دن بدن بڑھتی گئیں اور انہیں وسیع حمایت بھی حاصل ہوگئی۔

قدیم یوغیر شہر کاشغر جو سیاحتی مرکز کا تاثر دیتا ہے تاجروں اور صناعوں کا شہر ہے۔ سینٹرل اسکوائر کے آس پاس جس میں عیدگاہ مسجد کو نمایاں حیثیت حاصل

ہوئے۔ گھوڑا گاڑی، گدھوں پر اور پیدل چلتے ہوئے لوگوں کے درمیان چینی چہرے کم ہی نظر آئیں گے۔ ترکستانی مسلمان زنجیانگ کی کل آبادی میں سے 17 ملین ہیں۔ اس شہر کی تمام تر مصروفیات کے پیچھے ایک خوف رینگتا رہتا ہے۔ وہ یہ کہ حکومت کے مختلف محکموں میں زیر ملازمت یوغیر افراد ہی کہیں جاسوسی نہ کر رہے ہوں۔ عیدگاہ مسجد کے 73 سالہ امام حاجی ہارون خاں پر ابھی کچھ دن پہلے قاتلانہ حملہ ہوا تھا کیونکہ یوغیر باشندوں کو شک ہوگیا تھا کہ وہ حکومت کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور انہیں مسجد سے گھر کے راستے میں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس ماحول میں اجنبیوں سے ہم کلام ہونے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ اشاروں اور کنایوں ہی میں وہ کچھ سمجھا دے گا۔

اس کی دادی نے بچپن میں ہی بتایا تھا کہ مسلمان بے دین لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں اور پہلی بار اس نے یہ بھی جانا تھا کہ ہان چینی باشندے یوغیروں کو نفرت سے دیکھتے ہیں اور تبھی سے وہ خود کو ہان چینیوں کے خلاف آراستہ کرنے لگا تھا۔

چین کے نسلی اتحاد کا گن گانے والے لوگ بھی موجود ہیں جس کی مثال نوجوان یونیورسٹی گریجویٹ عسکر ہے جو روانی سے چینی زبان بول اور لکھ سکتا ہے اور چونکہ انگریزی بھی وہ ٹھیک ٹھاک جانتا ہے اس لئے اچھی سرکاری ملازمت میں ہے۔ اس کے بیان کے مطابق یوغیریوں کی بڑی تعداد میں گرفتاریاں ہوئی ہیں لیکن ارمقی اور کاشغر وغیرہ میں بم پھٹنے کا سلسلہ بند نہیں ہورہا ہے بلکہ اب تو بیجنگ میں بھی شروع ہوگیا ہے۔ چینی پروپیگنڈے کا چلتا پھرتا اشتہار ہونے کے باوجود وہ بہت سے یوغیروں کے اس خواب میں شریک ہے کہ آزادی کی آواز بلند کی جائے لیکن تشدد کی راہ اختیار کئے بغیر۔

عسکر کی بات درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ یوغیری باشندوں کا غم و غصہ اسی بات پر ہے کہ انہیں اپنی نسلی شناخت قائم رکھنے کی اجازت نہیں اور جو آخرکار بحیثیت ایک ثقافت کے زندہ رہنے پر اصرار کرتی ہے۔ یوغیروں کی کچھ آبادی چین، قزاخستان اور کرغستان میں بٹی ہوئی ہے اور چین میں ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے لیکن ان کا کوئی ملک نہیں ہے جب کہ زنجیانگ کی دیگر اہم اقلیتیں یعنی قزاقوں، کرگیزوں، تاجکیوں، ازبکوں اور منگولوں سبھی کی اپنی قومی ریاستیں ہیں۔ اس کے برعکس یوغیر باشندے ایک طرح کے جغرافیائی حصار میں ہیں اور جائیں تو کہاں جائیں۔ اس کے علاوہ 12 ملین ہان چینی دروازے پر کھڑے ہوئے ہیں۔ یوغیروں کو پورا شک ہے کہ ہان چینی ان کے علاقے میں عرصہ دراز تک قیام کرنے کی نیت رکھتے ہیں۔

ارمقی میں آباد یوغیروں کی اس خود پسندی کی وجہ فوراً سمجھ میں آنے لگتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ زنجیانگ کا یوغیری خود مختار خطے کا مرکز عملاً چینی شہر ہے اور کاشغر کے مقابلے میں یہاں کی دنیا ہی بدلی ہوئی ہے جس کا احساس فلک بوس

عمارتوں، دفتروں، بینکوں اور ہوٹلوں کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ یہاں یوغیروں کا کیا حال ہے؟ نئی لیموزین یا کاروں میں سوار بہت کم ہی یوغیری نظر آئیں گے۔ شہر کے وسط میں جائیں تو اس میں زیادہ تر کباب فروش صراف اور چوکیدار یوغیری ہوں گے۔ گویا کہ وہ خود اپنے وطن میں دوسرے درجے کے شہری بن کر رہ گئے ہیں۔

شاہراہ ریشم کے اطراف کے صحراؤں اور نخلستان میں ہان چینی وجود کے آثار دوسری صدی قبل مسیح کے زمانے سے پائے جاتے رہے ہیں۔ لیکن چینی اقتدار کا استحکام 59-1755ء کے دوران مانچو منگ سلطنت کی فتح کے ساتھ ہوا جب اس کا نام زنجیانگ پڑا یعنی نئی سلطنت۔ اس میں بھی وقتاً فوقتاً خونریزی اور بغاوت ہوتی رہی اور یہ سلسلہ 49-1944ء تک چلا۔ 1949ء میں ماؤزے تنگ کی فوجوں کی فتح نے چینیانے کے جامع منصوبے کے لئے راہ ہموار کردی۔ 1950ء سے 1990ء کے دوران جتنے ہان چینی زنجیانگ میں در آئے اتنے گزشتہ دو ہزار صدیوں میں نہیں آئے تھے۔ انتقال آبادی کا یہ کوئی قدرتی عمل نہیں تھا بلکہ یہ ریاستی سرپرستی میں چلائی جانے والی داخلی نوآبادیاتی مہم تھی جس کا مقصد اقتصادی طور پر اہم لیکن فوجی نقطہ نظر سے خطرناک علاقے پر قابض ہونا تھا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس علاقے کے چالیس سے پچاس فیصد افراد چینی نسل کے ہیں تاہم بہت سے یوغیر باشندے اس خیال سے متفق ہیں کہ ہان چینیوں کی آبادی کا تناسب پچاس فیصد سے تجاوز کر چکا ہے۔

زنجیانگ میں ہان چینیوں کی آمد کا آغاز 1956ء میں چنگ جی سے ہوا جو سترہ سال کی عمر میں مختلف علاقوں میں گھومتا ہوا ارمقی پہنچا اور پھر جوتا نا بندھا تو چالیس ہزار کی تعداد میں ہان چینی وہاں آ بسے۔ وہاں سے انہوں نے 230 کلو میٹر کے فاصلے پر واقع میدانی علاقے کا رخ کیا جس کے جنوب میں برفیلی پہاڑی چوٹیاں کھڑی تھیں اسی کے ساتھ وہاں زنجیانگ پروڈکشن اینڈ کنسٹرکشن کارپس کا مزارعی فوجی ڈویژن بھی اتر پڑا جسے اختصار میں "بنگٹوان" کے نام سے یاد کیا گیا اور یہی بنگٹوان زنجیانگ کے چینیانے کے عمل میں سنگ میل ثابت ہوا۔۔ یان جی چنگ نے تو یہاں خاک اڑتی دیکھی تھی اور خیموں میں اس نے زندگی کاٹ دی لیکن اب وہی میدان ایک

بالکل نئے صنعتی شہر میں تبدیل ہو چکا ہے اور اس کا نام "کوٹیون" ہے جہاں عام گزرگاہ ایک ہشت قطاری شاہراہ ہے جو اسے بجا طور پر قومی دارالحکومت کا مرتبہ عطا کرتی ہے یہاں کی آبادی ایک لاکھ سے کم ہی ہے جن میں بیشتر ہان چینی ہیں۔ یہ شہر باسیوں کا منتظر ہے اور انسانوں سے جلد ہی بھر بھی جائے گا لیکن شرطیہ طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس میں یوغیر کسانوں کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔

بیجنگ کو درپیش حالیہ مسائل کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

1980ء یعنی بارن تنظیم کے وجود سے پہلے اسلام کو یوغیری قوم پرستی اور شناخت کا حوالہ دیا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بیجنگ نے اس ثقافتی انقلاب کی جابرانہ پالیسیوں کو الٹ دیا جس کے تحت مساجد کو مویشی خانوں میں بدل دیا گیا تھا۔ نتیجتاً ایسی اسلامی بیداری پیدا ہوئی جو جتنی ثقافتی تھی اتنی ہی مذہبی بھی تھی۔ لاطینی کی جگہ عربی رسم الخط نے لی۔ فن تعمیر میں اسلامی رنگ آیا۔ سیکڑوں مساجد کھل گئیں۔ قرآنی علوم کے مدارس اور کالج قائم ہوئے اور ادائیگی حج میں اچانک دلچسپی پیدا ہوگئی۔ لیکن کھلی تجارتی پالیسیوں کا مطلب یہ بھی تھا کہ زنجیانگ بقیہ ایشیا سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ نئے تجارتی تصورات کے ساتھ غیر ملکی دولت بھی وہاں آئی اور ساتھ ساتھ پاکستان اور خلیجی ممالک سے مبلغین بھی آئے اور پڑوس کے قزاقستان سے ملک بدر کئے ہوئے لوگ بھی۔ نوجوان یوغیروں نے افغانستان کے جنگی میدان کا رخ کیا جہاں انہوں نے ایک اور کافر کمیونسٹ طاقت کے مقابلے میں جہاد کے جذبے سے اپنے دلوں کو منور کیا

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بارن تنظیم کے حامیوں نے حیرت زدہ اور برہم یوغیروں کے درمیان اپنا وسیع حلقہ بنالیا۔ سرکاری طور پر اس کا اعتراف ہوا ہے کہ 1993ء میں بعض علماء مساجد سے عوام کو دعوت جہاد دے رہے تھے اور یہی نہیں بلکہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبران اور سرکاری عہدیداران بھی زیر زمین اسلامی اور علیحدگی پسند سرگرمیوں میں شامل تھے اور شہری طلباء میں بھی علیحدگی پسندی کا پیغام دلچسپی سے سنا جارہا تھا۔ سرکاری حکام 1991ء سے ہی سیاسی طور پر ناپسندیدہ عناصر کی نشاندہی کی غرض سے علماء سے چھان بین کرتی رہی ہیں۔ انہوں نے غیر رجسٹرڈ



مساجد کو بند کر دیا، رجسٹرڈ مساجد کے باہر لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ممنوع قرار دے دیا۔ نوجوانوں اور بچوں کے لئے قرآن کے درس پر پابندی لگا دی۔ مذہبی مقاصد سے آنے والی غیر ملکی دولت پر کڑی پابندی عائد کر دی اور حج پر جانے والوں پر خاص عمر کی شرط لگا دی اور غیر قانونی مذہبی مطبوعات کو بھی ممنوع گردانا گیا۔ مساجد میں جانے والے کمیونسٹ پارٹی کے ممبران پر چھاپے مارے گئے۔

زنجیانگ کی سیاست سے بخوبی باخبر ایک غیر ملکی نے یہ تبصرہ کیا کہ حکومت اسلام کو متعین کردہ متشدد خطوط پر چلانے اور اسے اپنے یکسر ختم کرنے کے درمیانی طریق کار پر عمل کر رہی ہے۔ جس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ عسکر جو کہ خود سرکاری ملازم ہے اس کا کہنا ہے کہ اگر مجھے مسجد میں جاتے ہوئے دیکھا گیا تو میں ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا۔ آج کل وہ خفیہ طور پر گھر میں ہی نماز پڑھتا ہے۔

افغانستان کے حالیہ تجربے سے چوکنا ہو کر جہاں اسلام پسند طلباء نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی ہے چینی حکام مذہبی اداروں اور مدارس سے بہت خائف ہو گئے ہیں۔ تاہم وہاں ایسے آثار اس بات کے ہیں نہیں کہ طالبان اور یوغیر طلباء میں کوئی رابطہ ہو۔

کاشغر کی طرح ہوتان کا نخلستان بھی روایتی یوغیر ثقافت رہا ہے۔ جو حال ہی میں اسلامی احیاء کا مرکز بھی بن گیا ہے۔ ہرے بھرے کھیتوں، باغات اور انگور کے چمن سے گھرے ہوئے اور کولون پہاڑوں کی پگھلتی ہوئی برف سے سیراب ہوتے ہوئے اس پرسکون نخلستان کو خوابیدہ شہر کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ اگرچہ یہاں ایک مسجد بھی زیر تعمیر ہے لیکن حکومت کے خلاف یوغیریوں کا غم و غصہ اکثر ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ ایک سرکاری ملازم خالد کو ابھی گزشتہ سال احیائی سرگرمیوں میں شرکت کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس تجربے نے اس کا حوصلہ پست کر دیا اور وہ یہ سوچنے لگا کہ کاش وہ ایک یوغیر کی حیثیت سے نہ پیدا ہوا ہوتا۔ اس سال اس نے رمضان کے روزے بھی چھوڑ دئے۔

ہوتان میں پہلی بار کوئی سنگین مسئلہ جولائی 1995ء میں اٹھ کھڑا ہوا جب حکومت کی برتھ کنٹرول پالیسی پر تنقید کے الزام میں ایک مسجد کے امام کو گرفتار کیا گیا اور درس قرآن میں شریک ہوئے طلباء کے ایک مشتعل گروہ نے امام کی رہائی کا مطالبہ کرتے ہوئے کمیونسٹ پارٹی کے دفتر پر ہلہ بول دیا۔ بغیر کسی ہلاکت کے مظاہرین کو منتشر کر دیا گیا لیکن 260 افراد کی گرفتاری موقع پر ہی عمل میں آئی تھی اور بعض لوگ اس کے بعد بھی پکڑے گئے۔ تین رنگ لیڈروں کو پکڑ کر انہیں سولہ سال کے لئے لیبر کیمپ میں رکھ دیا گیا۔ گزشتہ سال ان گرفتاریوں کا سلسلہ انسدادی جرائم مہم کے تحت جاری رہا جس کا مقصد روپوش علیحدگی پسندوں کی گرفتاری تھی اور اسلحہ اور بارود کی برآمدگی بھی۔ لیکن ہر جگہ کی طرح ہوتان میں بھی علیحدگی پسند، علیحدگی پسند حامی اور کٹر مسلمان کے درمیان امتیاز دھندلا ہوتا گیا۔ چھ سو افراد کی گرفتاری اور مزید فوجوں کی تعیناتی کے باوجود ان دو برسوں میں مذہب زیر زمین فروغ پاتا رہا اور حکومت کی پالیسیوں کو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ وہ نوجوان جو رقص و سرود میں اپنا وقت گزارتے تھے وہ اب چھپ چھپ کر گھروں میں اکثر نماز پڑھتے ہیں۔

زنجیانگ میں چینی حکام کے چھاپوں نے مذہب کو زیر زمین ہو جانے پر ہو سکتا ہے مجبور کیا ہو لیکن اس میں پوری طرح انہیں کامیابی نہیں مل پائی ہے کیونکہ ابھی ایک علاقے میں امن و سکون بحال ہوتا ہے تو دوسرے علاقے میں انتشار بھڑک اٹھتا ہے۔ چینی حکام کبھی تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے مشکل پر قابو پالیا ہے لیکن دوسرے ہی دن اکسو کورلا یا بیجنگ میں کوئی دھماکہ ہو جاتا ہے جہاں ابھی پچھلے فروری میں نو افراد تشدد میں ہلاک ہوئے تھے جب سکیورٹی فورس نے آنسو گیس اور واٹر کینن کی مدد سے مشتعل مظاہرین کو منتشر کرنے کی کوشش کی تھی۔ آٹھ ماہ تک مساجد بند کرنے اور گرفتاریوں کے بعد بھی آج تک بیجنگ کے ماحول میں کشیدگی ہے۔

> اس شہر کی تمام تر مصروفیات کے پیچھے ایک خوف رینگتا رہتا ہے۔ وہ یہ کہ حکومت کے محکموں میں زیر ملازمت یوغیر افراد ہی کہیں جاسوسی نہ کر رہے ہوں۔ عید گاہ مسجد کے 73 سالہ امام حاجی ہارون خاں پر ابھی کچھ دن پہلے قاتلانہ حملہ ہوا تھا کیونکہ یوغیر باشندوں کو شک ہو گیا تھا کہ وہ حکومت کے ساتھ ملے ہوئے ہیں

جدید چینی تاریخ کے پروفیسر اور چینی اسلام کے ماہر مائیکل ڈلن کے مطابق حکام اور اسلام پسندوں میں تصادم سنگین تر ہوتا جا رہا ہے۔ پھانسی اور گرفتاری کی کارروائیوں سے "شہید" پیدا ہو رہے ہیں اور چینی حکومت کے خلاف اتنا شدید غم و غصہ گزشتہ دہائی کے دوران کبھی دیکھا نہیں گیا۔ اب نوجوان کچھ کر گزرنے کی ٹھان چکے ہیں۔ اب یہ بھی افواہ سننے میں آ رہی ہے کہ چینی فوجیں مسلح نوجوانوں کے گروہوں کی تلاش میں اور مشرق میں ریلوے لائن پر دھماکوں کے شبے میں اکسو کے شمال میں واقع پہاڑوں کو کھنگال رہی ہیں۔

بیجنگ نے حالیہ برسوں میں زنجیانگ کی سرحد سے ملے ہوئے پڑوسیوں خصوصاً پاکستان، قزاخستان اور کرغستان سے اچھے تعلقات رکھے ہیں جس کا مقصد زنجیانگ میں علیحدگی پسندی کی تحریک کی حمایت سے انہیں باز رکھنا ہے لیکن اس کا امکان کم ہی ہے کہ زنجیانگ میں اندر ہی اندر پنپتے ہوئے انتشار پر چین قابو حاصل کر لے گا۔ اس کے برعکس بڑے پیمانے پر گرفتاریاں، لیبر کیمپ کی طویل سزا اور پھانسی دئے جانے والوں کی کثیر تعداد یہ سب ایک دن اپنا رنگ دکھائیں گی۔ ☐

یورپ کے رخ سے اجنبیت کی سرکتی نقاب

کرسٹوفر اوروارنر کے قلم سے مغرب کے بدلتے منظر نامے پر ایک دلچسپ رپورٹ

ایشیائی اور افریقی تارکین وطن قافلہ در قافلہ یورپ میں آباد ہو کر اس براعظم کی شکل و صورت کو تبدیل کر رہے ہیں۔ اس تبدیلی میں مغربی یورپ کے باشندوں کو کوئی مثبت پہلو کیوں نظر نہیں آتا۔ خاموشی میں ڈوبے قدیم کلیساؤں کے لئے مشہور پیرس کے نواحی قصبے سینٹ ڈینس کے بازار میں نکل کر دیکھئے تو یہاں پر مختلف سرزمینوں سے آئے ہوئے لوگوں کی ایک بھیڑ خرید و فروخت میں مصروف ملے گی۔ ان میں پاکستانی بھی ہیں مالی اور الجیریا سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی۔ سب اپنے اپنے انداز میں مول بھاؤ کرتے ہوئے ہوں گے۔ سنیچر کو یہ لوگ قریب ہی واقع سٹی ہال میں قطار بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور بعض دفعہ مختلف قوموں اور مذہبوں سے وابستہ افراد کی شادیاں بھی ہو جاتی ہیں۔ الجیریائی عالی لیسری جو ایک چھوٹی سی صفائی کمپنی کا شریک مالک ہے اس کا کہنا ہے کہ ہم سب کہیں نہ کہیں سے آئے ہیں لیکن یہ بھی یکساں طور پر درست ہے کہ وہ کہیں کے بھی نہیں ہیں۔ بازار کے درمیان ایک سبزی کی دوکان کے پاس رکتے ہوئے لیسری کہتا ہے میں سمجھتا تھا کہ میرا تعلق دو ثقافتوں سے ہے"۔ اس کا کہنا صحیح بھی ہے۔ وہ گیارہ سال کی عمر میں فرانس آگیا تھا۔ اس نے ایک فرانسیسی بزنس اسکول سے ڈگری حاصل کی لیکن اس کے اقامتی کارڈ کی مدت اسی وقت ختم ہوگئی تھی جب وہ الجیریا میں فوجی ملازمت میں تھا۔ اس کے خاندان والے دوست احباب اور روزی روٹی کا ذریعہ سب کچھ یہاں ہے لیکن وہ یہاں رہنے کا حق نہیں رکھتا۔ دوہری شہریت کے حصول کے لئے اس کی درخواست پر کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ " اگر آپ خود کو فرانسیسی محسوس کرنا بھی چاہیں تو بھی آخر کار آپ کو یہی محسوس کرایا جائے گا کہ آپ اس نظام کے باہر ہیں۔ لیسری کے مطابق میں جانتا ہوں کہ فرانسیسی ہمیں یہاں دیکھنا نہیں چاہتے۔



لندن: جہاں اسلامی اثرات کا احساس بڑھتا جارہا ہے

در حقیقت یورپ خود نہیں جانتا کہ اپنے یہاں موجود تارکین وطن کا کیا کرے اور اسے اس بات سے بھی ڈر لگا رہتا ہے کہ تارکین وطن نہ جانے اس کا کیا کر ڈالیں۔ بعض ماہرین آبادیات کو یورپی براعظم کی ثقافتی بیداری کا امکان بہت روشن نظر آتا ہے کیونکہ نو واردین اپنے ساتھ ایک نئی طاقت، تخیل اور اپج اور مہم جویانہ جذبہ لے کر یورپ آتے ہیں۔ اٹلی میں تارکین وطن کی تعداد کا تناسب کل آبادی کا دو فیصد ہے جب کہ آدھے سے زیادہ فرانسیسیوں کا کہنا ہے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ اسی طرح جرمنی کی نصف آبادی کا خیال ہے کہ تارکین وطن کی تعداد کل آبادی کے دو فیصد سے کہیں زیادہ ہے۔ فرانسیسی سیاست میں تارکین وطن کا مسئلہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ صرف تارکین وطن کی بڑی تعداد میں وہاں موجودگی نہیں ہے کیونکہ دائیں بازو کی نیشنل فرنٹ حکومت نے مزدور طبقے کے غم و غصے کو بڑی کامیابی سے فرو کیا ہے۔

اسی لئے جب لیسری نے اس طرف اشارہ کیا کہ وہ وہاں غیر مطلوب ہے تو اس سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ تارکین وطن کا رول آج کی عالمی معیشت میں ملٹی نیشنل کارپوریشنوں سے کم نہیں۔ غریب ممالک کی طرف سے دولت مند ممالک کی طرف بڑی تعداد میں مزدور پیشہ افراد نہ صرف میڈیٹر نیشن یا **Rio Grande** کے اس پار جارہے ہیں۔ پراگ کے ہر دس میں سے ایک فرد غیر ملکی ہے اسی طرح بداپسٹ میں غیر ملکیوں کی تعداد پانچ فیصدی ہے۔ سویڈن میں جنوب ایشیائی تارکین وطن کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی طرح سوئزر لینڈ کی مجموعی آبادی کا چھٹا حصہ غیر ملکیوں پر مشتمل ہے۔ کیتھولک فرانس میں پروٹسٹنٹوں اور یہودیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اٹلی، اسپین، برطانیہ اور بیلجیئم میں اسلام دوسرا بڑا مذہب ہے۔

مغربی یورپ کے بیشتر حصے کے لئے دنیا پلٹ گئی ہے۔ فرانسیسی ماہر آبادی جین کلاڈ کے مطابق یورپ پوری دنیا کو یورپی رنگ میں ڈھالنے کا عادی رہا ہے کیونکہ

ایک صدی سے زائد عرصے تک یورپی ممالک ان ہی نوآبادیات پر یورپی ثقافت مسلط کرتے رہے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں ان کی آبادی برآمد ہوتی رہی ہے لیکن اس بہاؤ کا رخ بدل کر الٹی سمت میں ہوگیا ہے اور افریقہ اور ایشیا سے کثیر آبادی ایسے براعظم کا رخ کر رہی ہے جسے جین کلاڈ نے "بنجر لیکن متمول" کہا ہے۔ اب یورپ کے عالمی رنگ میں ڈھلنے کی باری ہے۔

یورپ کی داخلی سرحدوں کے کھلے ہونے کی وجہ سے اس طرف زیادہ توجہ کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے کہ غیر قانونی طور پر داخل ہونے والے تارکین وطن کو کیسے روکا جائے۔ لیکن اس سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ ان سے کیسے نمٹا جائے جو پہلے سے اندر موجود ہیں یا غیر قانونی طریقوں سے آئے چلے جارہے ہیں۔ ہر ملک نے مسئلے کا حل اپنے الگ الگ انداز سے سوچا ہے۔

جرمنی ان تارکین وطن کی منزل مقصود بن چکا ہے جن میں سے زیادہ تر لوگ اس ملک میں اصلاً مہمان مزدور کے طور پر یا حریت پسندانہ قانونی پناہ کے تحت آئے تھے اور آج جرمنی کی آبادی کا دسواں حصہ غیر جرمن نژاد افراد کا ہے۔ تاہم ان لوگوں کو جرمن شہریت ملنے کی امید کم ہے اور ترک مسلمانوں کی آبادی جن کی تعداد بیس لاکھ سے زیادہ ہے جرمن معاشرے کا حصہ بننے کے بجائے اپنے آپ میں سمٹ گئی ہے

برطانیہ کے نقشے پر کیوبیائی، ہندوستانی افریقی، پاکستانی، بنگلہ دیشی اور چینی تارکین وطن کے نقش ونگار جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں اور انہوں نے خود کو مختلف انداز سے مقامیت میں ضم کیا ہے۔ بیشتر چینی نوجوانوں کا کہنا ہے کہ ان کا کوئی مذہب نہیں ہے یا یہ کہ اس بات میں مذہب کا بہت کم دخل ہے کہ وہ اپنی زندگی کیسے گزارتے ہیں جب کہ پاکستانی اور بنگلہ دیشی مسلمانوں کی دو تہائی آبادی کا خیال ہے کہ مذہب ان کی زندگی کا غالب عنصر ہے۔

سرکاری سطح پر برطانیہ نے اس کثرت یا ثنویت کا حل اسے بعینہٖ قبول کرکے بلکہ اسے قانونی حیثیت دے کر نکالا ہے۔ اس کا مقصد مختلف قومیتوں کے افراد کو برطانوی معاشرے میں ضم کرنا نہیں ہے بلکہ ان نسلی گروہوں کے ساتھ تعامل سے جنہیں اپنی علیحدہ حیثیت برقرار رکھنے کی اجازت ہے اور اس کے لئے ان کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی ہے۔ 1960ء کی دہائی کے بعد سے نسلی اقلیتوں کے چوتھے برطانوی نیشنل سروے رپورٹ کے اختتام میں طارق محمود نے لکھا ہے کہ مساوات کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی فرد اپنے حسب نسب، خاندان یا برادری کی پردہ داری کرے یا اس سے وابستگی پر اعتذار پیش کرے بلکہ دراصل اس کا مطلب دوسروں سے ان باتوں کے احترام کی توقع اور عوامی رجحانات اور حالات کو قبول کرنے کا جذبہ ہے۔

سروے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ زیر مطالعہ دیگر گروہوں کے دو تہائی حصے کا بیان ہے کہ وہ اپنے آپ کو برطانوی ماحول کا ہی ایک حصہ سمجھتے ہیں۔

فرانس جو اپنی انسانی برادری اور مساوات کے ری پبلکن اصول پر اصرار کرتا رہا وہ تارکین وطن کو محض افراد سے تعبیر کرتا ہے اور اہم بات یہ ہے کہ ایسے افراد سے جو فرانسیسی بننا اور کہلوانا پسند کرتے ہیں اور اس کو چھوڑ کر ہر شناخت سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ ثقافتی شناخت کے لئے ایسی علامات اختیار کی گئی ہیں کہ سرکاری اعداد و شمار میں فرانسیسی شہریوں کے نسلی یا قومی نقطہ آغاز کا اندراج نہیں ہوپاتا۔ لیکن عملی طور پر اس کا ہاتھ آنا مشکل ہے۔ ایک اور جامع سروے اس دوران ہوا ہے جس سے معلوم ہوا ہے کہ فرانسیسی معیارات کے مطابق ثقافتی انضمام کا عمل ابھی چل رہا ہے۔ کیونکہ شمالی افریقی تارکین وطن اپنے بچوں سے فرانسیسی بولنے کی کوشش کرتے ہیں اور خود ان کی زبانیں یعنی عربی یا بربر تیسری نسل تک معدوم ہوجانے کا میلان ظاہر کر رہی ہیں۔ ان کی اولادوں میں سے آدھے تو ایسے ہیں ہی جو فرانسیسی شہریوں کے ساتھ شادی کرکے گھر بسالیتے ہیں۔

> اگر آپ خود کو فرانسیسی محسوس کرنا بھی چاہیں تو بھی آخر کار آپ کو یہی محسوس کرایا جائے گا کہ آپ اس نظام کے باہر ہیں۔ لیسیری کے مطابق "میں جانتا ہوں کہ فرانسیسی ہمیں یہاں دیکھنا نہیں چاہتے۔"

لیکن لیسیری اور اس کے کئی پڑوسیوں کا مثبت پہلو شاید ہی ابھی واضح ہوا ہو۔ جب معیشت کی گاڑی مشکل سے کھسک رہی ہوتی ہے تو مقامی آبادی غیر مقامی افراد کو اپنے وجود کے لئے خطرہ سمجھتی ہے۔ فرانس میں جائز طور پر داخل ہونے والے تارکین وطن کی تعداد کسی بھی سال میں پچاس ہزار سے تجاوز نہیں کرنی چاہئے لیکن سیاسی بحثوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعداد مقررہ حد سے کہیں زیادہ ہے۔

سینٹ ڈینس کے اطراف میں پبلک ہاؤسنگ پروجیکٹوں میں غیر قانونی تارکین وطن کی تعداد میں دس برسوں میں ڈرامائی طور پر اضافہ ہوا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر کے پاس کام کرنے کے اجازت نامے تھے۔ کئی لوگ چوری چھپے وہاں پہنچے تھے لیکن کنزرویٹو فرانسیسی حکومتوں نے ان کے ورک لائسنس کی تجدید کو حد سے زیادہ مشکل بنا دیا ہے۔ جون میں برسر اقتدار آنے والے سوشلسٹوں نے اس دباؤ کو کم کرنے کا وعدہ کیا ہے اور بہت بچتے بچاتے پچھلے دنوں قومیانے کے سلسلے میں ایک حریت پسندانہ قانون پاس کیا ہے لیکن بیوروکریسی کو تارکین وطن سے ہمدردی کے خیال سے بیر رہا ہے۔ مالی کے ایک باشندے کو دو سال کام کر چکنے کے بعد ورک پرمٹ کی تجدید سے انکار کر دیا گیا۔ اس کے بعد بھی وہ سات سال تک کام کرتا رہا اور ٹیکس بھی ادا کرتا رہا۔ اس غیر قانونی صورت حال سے پریشان ہوکر اس کے مالک نے اسے ملازمت سے نکال دیا۔ اب وہ رشتہ داروں اور دستوں کے رحم و کرم پر بے روزگار پڑا ہوا ہے۔

مہاجرین کے تئیں اعتدال پسندانہ پالیسی کے حامی یورپین بھی اخلاقی بنیادوں پر ہی نرمی برت پاتے ہیں۔ ان کے درمیان اس موضوع پر ہونے والے مباحثوں میں اس اہم حقیقت کو نظرانداز کیا جاتا ہے کہ تارکین وطن مقامی معیشت کو مضبوط کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے ملازمتوں کے امکان میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور اس کی روشن مثال امریکہ کی ہے لیکن اس کی طرف سے شاید انہوں نے آنکھ بند کر رکھی ہے۔ امریکی معیشت نے چالیس ملین روزگاری اسامیاں پیدا کی ہیں کیونکہ وہاں ایک ملین تارکین وطن ہر سال آتے ہیں اور ان کو روزی روٹی فراہم کرنے کے لئے مکمل روزگار کی سہولت دیتی ہیں۔ تارکین وطن کو باہر نکالنے میں مصروف یورپ میں روزگار کی صورت حال اپنی انتہا پر ہے۔ یورپ کو ضرورت ہے کام کرنے پر آمادہ محنت کشوں کے لشکر کی، مزید مہم پسند تارکین وطن اور اپنے خاندانوں کی کفالت کرتے ہوئے تارکین وطن کے ذریعے اشیاء کی کھپت کی اسی لئے جین کلاڈ نے تارکین وطن کے لئے امریکہ کی طرح ہی تعلیم اور عملی صلاحیتوں کی بنیاد پر کوٹا مقرر کرنے کی حمایت کی ہے۔

یورپ کا چہرہ بہر حال بدل رہا ہے اور اس حقیقت سے انکار خود کو ثقافتوں کے حقیقی تصادم کے دہانے پر لانا ہے۔ مستقبل کا تحفظ سینٹ ڈینس کے قدیم کلیسا میں سمٹ کر بیٹھنے کا نہیں بلکہ بازار میں آکر لین دین کرنے میں ہے۔ ▭

عالمی مالیاتی فنڈ یا عالمی نظام استحصال

آئی ایم ایف کی کارگذاریوں پر ایک چشم کشا رپورٹ

تحریر: ڈیوڈ فرائڈمین

جوں جوں ایشیا کی گرتی ہوئی معیشت کو سنبھالنے کے لئے مالی امداد کی قیمت آسمان کو چھو رہی ہے گمنام فرانسیسی صراف کی سربراہی میں سرگرم عمل دوسری جنگ عظیم کے زمانے کی یادگار عالمی مالیاتی فنڈ اخباری سرخیوں کی زینت بنتا جارہا ہے؟ کیا یہ ادارہ ایسی ذمہ داری کو نبھانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس کا جواب کسی زمانے میں پھلتے پھولتے ایشیا کو اچانک برباد کردینے والے سبک رفتار اقتصادی چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے امریکی آمادگی کے بارے میں تشویشناک خیالات کو جنم دیتا ہے۔



آئی ایم ایف 1944ء میں ان اسباب کے تحت وجود میں آیا تھا جو آج یکسر بے معنی ہیں۔ اس خوف سے کہ 1930ء کے زمانے جیسی افراط زر کی صورت حال پھر سے جنگ نہ بھڑکا دے جو اکیس بڑے مغربی ممالک کی ایک میٹنگ برٹن وڈ، این ایچ میں ہوئی تھی جنہوں نے زر مبادلہ کی ایک متعینہ شرح کی بنیاد ڈالی۔ انہی چوالیس ممالک نے اس میٹنگ کے دوران آئی ایم ایف کی ایجاد کی جس کا کام تھا تنے ضابطوں کے نفاذ کی نگرانی کرنا۔ ممبر ممالک سے حاصل شدہ رقوم کے ذریعے اگلی تین دہائیوں تک آئی ایم ایف اپنے محدود اختیارات کا استعمال کرتا رہا۔ یہ ادارہ کسی تھکے مارے ملک کو جس کے گولڈ یا دیگر ریزرو کو خطرہ لاحق ہو اپنی حالت سدھارنے کے لئے ایک سال تک قرض دے سکتا تھا۔ اس کے بدلے میں قرض لینے والوں کو بعض شرائط کی پابندی کرنی ہوتی تھی جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ عوامی اخراجات کم کئے جائیں تاکہ قومی میزان متوازن اور کرنسی مستحکم ہوسکے۔

1973ء میں برٹین وڈس نظام کو توڑ کر متواتر تبدیل ہونے والی شرح زر مبادلہ کا نظام لایا گیا چونکہ اس کا مقصد ختم ہوچکا تھا اس لئے اس مالیاتی ادارے کا وجود بھی ختم ہوجانا چاہئے تھا۔ اس کے بجائے آئی ایم ایف نے 1970 اور 1980ء کی دہائیوں میں تیل کی قلت اور قرضوں سے پیدا شدہ بحران تک اپنے اختیارات کو وسیع کرلیا۔

1970ء کی دہائی کے اواخر تک تیل اور توانائی کی قیمتوں میں اضافے اور میکسیکو، برازیل اور ارجنٹینا جیسے ممالک کے ناقابل عبور افراط زر اور بھاری قرضوں میں دب جانے سے آئی ایم ایف نے اپنی مالی صلاحیت 70 بلین ڈالر سے زیادہ بڑھائی۔ اور اس نے خصوصاً ترقی پذیر ممالک کو زیادہ طویل

مدت کے لئے زیادہ رقوم کے قرض دینے شروع کر دئے۔ اگرچہ زیادہ تر معاملات میں کوششیں معیشت میں استحکام لانے کی غرض سے برٹن وڈس کے دور میں کئے گئے اقدامات سے ہی مماثل تھیں۔ در حقیقت آئی ایم ایف ایسے تمام ممالک کی معیشتوں کے ساتھ کہیں زیادہ پرپیچ اور جوکھم سے بھرا ہوا اشتراک و تعاون کر رہا تھا۔

تقریباً ہمیشہ رازدارانہ انداز میں کام کرتے ہوئے آئی ایم ایف قرض کے درخواست گزار کی مدد کے طور پر اس کے قومی حسابات کے بنیادی تخمینے حاصل کرتا ہے جس کے تحت وہ یہ دیکھتا ہے کہ کوئی ملک کیا اور کتنا کما سکتا ہے اور اضافی مال یا دولت پیدا کرنے کے لئے اسے کتنا خرچ کرنا ہوگا۔

قومی حدود سے بالاتر مشیر کار کی حیثیت سے آئی ایم ایف کے عہدیداران اس کا جائزہ لیتے تھے کہ کوئی ملک عالمی منڈی کے لئے کتنی پیداوار پیدا کرنے اور اسے فروخت کرنے پر قادر تھا۔ نیز یہ کہ خام مال اور خوراک اور توانائی جیسی چیزوں پر اسے کتنا خرچ برداشت کرنا تھا جس سے وہ کم از کم اپنے شہریوں کو کچھ راحت دے سکے۔ قرض کی شرائط پھر اسی حساب سے وضع کی جاتی تھیں جس سے مقروض فریق کا طرز عمل آئی ایم ایف کے ماہرین اقتصادیات کے منصوبے کے مطابق قومی آمدنی کے مقاصد کے حصول میں معاون ہو۔

یہ آرزومندانہ منشور خواہ کتنے ہی اچھے مقاصد اپنے پیچھے رکھتا ہو اس کے واضح ثبوت موجود ہیں کہ وہ ان مقاصد کی تکمیل میں ناکام رہا۔ آئی ایم ایف پر شدید نکتہ چینی کرتے رہنے والے ادارے ہیری ٹیج فاؤنڈیشن کے مطابق 1995-1965ء کے دوران 137 ممالک میں سے آئی ایم ایف کا قرض لینے والے 81 ممالک کا انحصار آئی ایم ایف پر بڑھتا ہی رہا ہے اور اس میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ اسی مدت میں کم ترقی یافتہ 89 مقروض ممالک میں سے 48 کی مالی حالت میں کوئی سدھار نہیں آیا اور ان میں 32 تو ایسے ہیں جو آئی ایم ایف کی مداخلت سے پہلے کے زمانے کے مقابلے میں کہیں زیادہ غریب ہوگئے۔

1980ء کی دہائی کے اوائل میں فنڈ کے دو سب سے بڑے شرکاء برطانیہ اور امریکہ میں ریگن اور تھیچر کے دوبارہ برسراقتدار آنے کے واقعے اور اس مایوس کن ریکارڈ کی یکجائی سے آئی ایم ایف بیٹھ چکا ہوتا۔ لیکن اس کے بجائے امریکہ میں بچت اور قرضوں کے بحران، تیل کے دوسرے جھٹکے اور لاطینی امریکہ کے قرضہ جاتی بحران نے اسے نئی زندگی دے دی۔ فرانسیسی خزانے کے سابق ڈائریکٹر مائیکل کامڈیس کو 1987ء میں ریگن انتظامیہ کی مدد سے فنڈ کی سربراہی پر مامور کیا گیا جو فرانسیسی سوشلسٹ حلقوں سے ان کے معروف روابط اور جاپانی اور فرانسیسی قیادت کے سائے میں آگے بڑھتی معیشتوں سے ان کی مشکوک ہمدردی کی فضا میں ایک مضحکہ خیز تبدیلی تھی۔ 1990ء تک آئی ایم ایف کے ممبران کی تعداد 181 ہوگئی اور ان کا جنگی بجٹ 183 بلین ڈالر تک پہنچ گیا۔

1995ء میں میکسیکو کا قرضہ جاتی بحران فنڈ کے لئے طوفان سے کم نہ تھا۔ امریکی خزانے کے سکریٹری کی قربت حاصل کرکے جن پر کانگریس کی طرف سے سخت تنقیدیں ہو رہی تھیں آئی ایم ایف نے قومی معیشت اور قرضوں سے راحت کا تاریخ کا سب سے بڑا سودا طے کر لیا۔ جب میکسیکو نے امریکی قرضہ معینہ مدت سے پہلے واپس کر دیا تو مائیکل اور کلنٹن انتظامیہ میں ان کے حلیفوں کی بہت بڑی جیت ہوئی۔

کیا آئی ایم ایف یہی کہانی ایشیا میں دہرا سکتا ہے؟ ایک پریشان کن علامت یہ ہے کہ چوکسی اور منصوبہ بندی کی بے مثال صلاحیتوں کی ڈینگ مارنے کے باوجود آئی ایم ایف کسی بحران کا پہلے سے اندازہ کرنے میں پوری طرح ناکام رہا۔ اس کی 1997ء کی رپورٹ میں جنوبی کوریا کے قابل رشک اقتصادی ریکارڈ اور تھائی لینڈ کی وسیع تر اقتصادی پالیسیوں کو داد و تحسین دی گئی ہے۔ اس کے چند ہی ماہ بعد مائیکل ان دونوں ملکوں کو اپنے خفیہ وفد بھیج رہے تھے تاکہ وہ انہیں آنے والے بحران سے خبردار کر سکیں۔

> ایک پریشان کن علامت یہ ہے کہ چوکسی اور منصوبہ بندی کی بے مثال صلاحیتوں کی ڈینگ مارنے کے باوجود آئی ایم ایف کسی بحران کا پہلے سے اندازہ کرنے میں پوری طرح ناکام رہا۔

ماضی میں آئی ایم ایف نے جن مسائل اور چیلنجوں کا سامنا کیا ہے ایشیا کے مسائل اس سے مختلف ہیں۔ 1980ء کی دہائی کے برخلاف ایشیائی معیشتوں کو چند ہی کرنٹ اکاؤنٹ خساروں اور نچلی سطح پر افراط زر کا سامنا تھا۔ ان باتوں کے بجائے ان کے حالیہ مصائب کا سرچشمہ وہ مالی اور قرضہ جاتی حکمت عملی ہے جس نے انہیں متوقع کرنسی بحران کی زد پر لا کھڑا کیا ہے۔

غیر ملکی سرمایہ بٹورنے کی غرض سے جنوبی کوریا اور تھائی لینڈ جیسے ممالک ڈالر اور دیگر مضبوط کرنسیوں کے عوض اپنی کرنسی کو تبادلہ متعینہ شرح پر کرتے تھے۔ اس سے سرمایہ کاروں اور قرض دینے والوں دونوں کو یقین رہتا تھا کہ وہ آسانی سے ملک سے باہر جا سکتے ہیں اور یہ علامت تھی قومی استحکام و اعتماد کی۔

لیکن کرنسی کے تبادلے کی شرح کے تعین میں خطرات بھی ہیں۔ اسی طرح جیسے کہ صرافہ بازار میں ہوتا ہے۔ جب کسی مخصوص بڑی ساکھ دار کمپنی کی آمدنی کی شرح نیچے چلی جاتی ہے تو بازار اچانک بیٹھ جاتا ہے اور قلیل مدتی تجارتی نقصان یا تبادلے کی شرح میں اتار چڑھاؤ پورے خطے میں مقامی کرنسی کی اونے پونے فروخت کی فضا پیدا کر دیتا ہے۔

ایشیا میں یہی سب ہوا۔ تھائی لینڈ اور کرنسی کی فروخت کے زور سے مبہوت ہو کر اصل دھارے میں شامل سرمایہ کاروں نے متعینہ شرح تبادلہ پر پیسے کا مطالبہ کیا

عالمی سطح پر قرض دینے والے اداروں میں اس سے ہلچل مچ گئی۔ وہ ڈالر یا ین میں ادائیگی چاہتے تھے اس لئے انہوں نے قلیل مدتی قرضوں کی ہی پکار شروع کر دی جسے وہ عموماً تلے اوپر کرتے رہتے تھے۔ تیزی سے ترقی کرتے ہوئے ایشیائی ملکوں کے پاس مضبوط کرنسی کا ذخیرہ ختم ہو گیا جس سے وہ تبادلہ کرسکتے۔

اس کے جواب میں امریکہ اور دیگر بااثر ممالک بعض پالیسیوں کی تجویز رکھ سکتے تھے جو دنیا بھر میں نامناسب حد تک خوف کے زیر اثر کرنسی کی فروخت کو اعتدال پر لاسکیں۔ اگر ایشیا قرض کی سطح تیز رفتار عدم افراط زر کی صورت پیدا کرسکتی ہے تو اس اعتبار سے امریکہ جو کسی کی بھی نظر میں خطرے کی زد پر نہیں ہے زیادہ بری حالت میں معلوم ہوتا ہے۔

روبن جیسے امریکی لیڈر اس بحران کو ایک اور ایسا مرض سمجھتے ہیں جس کی دوا آئی ایم ایف کے پاس نہیں حالانکہ اس دوا کی تاثیر کے بارے میں اتفاق رائے نہیں ہے اور آئی ایم ایف نے خود ہی حال ہی میں ایشیا کو دنیا کے صحت مند ترین اقتصادی خطوں کے زمرے میں رکھا ہے۔

امریکہ اس خیال کی توثیق کیوں کرے گا؟ ظاہر ہے مصلحت پسندی کی بناء پر میکسیکی بحران نے کلنٹن انتظامیہ کو یہ سبق دیا ہے کہ وہ آئی ایم ایف جیسی کثیر جہتی تنظیموں کی مدد سے سرکش کانگریس پر بالادستی قائم کرلے گا۔ دوسرا سبب تجارتی مراعات کا ہے۔ امریکہ اپنے "بازار کھولنے" کے مقصد کو آئی ایم ایف کے مقاصد کا حصہ بنا کر ایشیا میں اپنی تشویشناک حد تک گرتی ہوئی تجارت کو پھر سے زندہ کرسکتا ہے۔ تیسرا سبب سیاست ہے جس کے تحت بڑے سرمایہ کاروں کو ایشیائی مالی ابتری سے بچانے کے عمل نے کلنٹن کے زبردست حامی وال اسٹریٹ کو خاموش کر دیا اور روز افزوں اضطراب کی طرف بڑھتے ہوئے درمیانی طبقے کو مزید یقین دلا دیا کہ صرافہ بازار پر ابھی اور رقم چڑھے گی۔

ایشیا کو آئی ایم ایف کے ایک اور باسکٹ کی حیثیت سے نظرانداز کرنے کے رجحان نے سرمائے کی عالمی منڈی کی اشتعالیت پر سے توجہ ہٹا دی جب کہ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کا حل کسی کو نہیں معلوم۔ یہی وہ رجحان ہے جس نے قرض کے بل بوتے پر قطرہ قطرہ گھٹتی معیشت کو چلانے کے لئے خود امریکہ کی صلاحیت پر گفتگو کا کبھی موقع نہیں دیا۔

آئی ایم ایف ترجیحی سے زیادہ فریب کارانہ طریقوں سے ایشیائی بحران کا منصرم بن گیا۔ اس کے باوجود یہ ممکن ہے کہ آئی ایم ایف کوئی ایسا معاملہ طے کرلے جو فکر مند سرمایہ کاروں کو ٹھنڈا کرنے اور ایشیا کی ترقی کا بیڑہ پھر سے اٹھانے میں کامیاب ہوسکے۔

اس طرح آئی ایم ایف ترجیحی سے زیادہ فریب کارانہ طریقوں سے ایشیائی بحران کا منصرم بن گیا۔ اس کے باوجود یہ ممکن ہے کہ آئی ایم ایف کوئی ایسا معاملہ طے کرلے جو فکر مند سرمایہ کاروں کو ٹھنڈا کرنے اور ایشیا کی ترقی کا بیڑہ پھر سے اٹھانے میں کامیاب ہوسکے۔

لیکن اگر میکسیکو کی طرح ایشیا کے مسائل بالاخر پہلے صفحے سے ہٹ جاتے ہیں تو 1940ء کی دہائی کے سروکاروں کے بجائے موجودہ زمانے کے اقتصادی مسائل کا حل تلاش کرنا آج بھی ضروری ہوگا اور اگر ایشیائی بحران سے کوئی گہرا سبق ملتا ہے تو وہ یہ ہے کہ سرمائے کی بے لگام نقل و حرکت کی دنیا میں جس میں تبدیلیاں حریصانہ مقاصد کے ہاتھوں آتی رہتی ہیں، مثالی معیشتوں کو بھی پہلے سے آگاہ کئے بغیر کسی فرانسیسی بیوروکریٹ کی اطاعت پر مجبور کر دیا جاتا ہے اور اس بات سے ہر امریکی کو اتنا ہی خوف زدہ ہونا چاہئے جتنا کہ دن بدن گرتی ہوئی کرنسی اور راتوں رات جائیدادوں کی قیمت میں گراوٹ سے۔

بقیہ: مجبوری کے ہاتھوں میں اپنا گردہ بیچنا چاہتا ہوں

ہے۔ آپ نے یہ نہیں لکھا کہ کیا پہلے سے آپ کے پاس کوئی روزگار تھا دیگر آپ کے کیا وسائل ہوسکتے ہیں۔ آپ کی تعلیمی صلاحیت کیا ہے وغیرہ۔

بیوی اور بچوں کے ذکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ پر تنگی ایک دم سے آئی ہے جس نے آپ کو اس قدر دل برداشتہ کر دیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ اچھی طرح غور کریں یہ حالت آپ کی کیوں ہوئی کوئی فرض عادت تو آپ کو ایسی نہیں جس نے آپ کی یہ ساری جمع پونجی نچوڑ لی ہے اور آپ فقر و فاقے سے گزر رہے ہیں۔ دست سوال دراز کرنا انسانی غیرت کے منافی ہے اور اس لئے اسلام کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ علاوہ اس حالت کے کہ واقعی انسان پر فاقہ گذرنے لگے۔ آپ اللہ تعالیٰ سے مدد مانگیں اور اگر عبادات پر قائم نہیں ہیں تو فوراً اس کی پابندی کی طرف توجہ دیں۔ اپنے محلے پڑوس میں جو اصحاب خیر اور دیندار حضرات ہوں ان کے سامنے اپنی مشکل بیان کریں اور سردست چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے میں بھی کوئی عار نہ محسوس کریں۔ ماشاء اللہ آپ جوان ہیں اور محنت کرسکتے ہیں۔ آپ کی محنت اور ایمانداری کی بناء پر ہی کوئی ایسا کام مل جائے گا جس سے کہ فاقہ ٹل جائے۔ مساجد میں آپ دیندار لوگوں کے ساتھ بیٹھیں اور ان سے اپنی مشکلات کو حل کرنے میں مشورہ طلب کریں۔ اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے بشرطیکہ آپ بھی اپنی نیکی اور دیانتداری کا ثبوت فراہم کریں۔ انشاء اللہ ان میں ایسے لوگ ضرور سامنے آئیں گے جو آپ کی مدد کریں گے اور آپ اپنے اس ارادے سے باز آجائیں گے جو مزید آپ کے لئے پریشانیاں پیدا کرے گا۔

دنیائے اسلام میں امریکی کھیل کی بساط الٹ گئی

گلس کیپل کے قلم سے نئی صورت حال کا ایک تجزیہ

ترجمہ: کوثر فاطمہ

آج مشرق وسطی میں عام آدمی ہو یا دانشور ہر ایک کے دل میں امریکہ کے خلاف نفرت بڑھتی جارہی ہے۔ یقیناً یہ اس صورت حال سے مختلف ہے جو خلیجی جنگ کی ابتدا میں اور عرب اسرائیل امن معاہدے کی شروعات کے دوران پائی جاتی تھی۔ تب عام طور پر لوگ امریکہ کو اپنی مخصوص صورت حال میں فٹ محسوس کرتے تھے اور خلیجی جنگ میں امریکی فتح کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی عام تھا کہ امریکی جس پالیسی کے علمبردار ہیں وہ حق سے زیادہ قریب ہے۔

عراق کو پابندیوں کے ذریعے تابع کر دیا گیا تھا اور اسرائیل نے یاسر عرفات کی قیادت میں ایک فلسطینی ریاست کو قبول کرلیا تھا۔ اس طرح عرب دنیا میں ایک عام آدمی خواہ وہ قاہرہ میں رہتا ہو یا دمشق میں، اسے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا امریکہ نے اسرائیل کو اس بات پر آمادہ کرلیا ہے کہ وہ فلسطینیوں کے حقوق انھیں لوٹادے اور یہی وجہ تھی کہ اگر عراقی ٹھکانوں پر مسلسل اسلحوں کو ناکام بنایا جاتا رہا تو اس پر عام آدمی کو تشویش لاحق نہ ہوئی غالباً وہ یہ سمجھتا تھا کہ امریکہ ہر سطح پر انصاف کر رہا ہے۔

عرب حکومتوں کو اس بات پر خوشی تھی کہ امن قائم ہوجانے کے بعد دوبارہ معاشی خوشحالی کا دور شروع ہوگا اور ان ملکوں میں جو عوامی خفگی ہے وہ جلد ہی ختم ہوجائے گی۔ اس طرح انھیں اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کا موقع مل جائے گا۔

آج امریکی انصاف کا پرانا قصہ سراب معلوم ہوتا ہے اور عام عرب کو یہ سب کچھ ناانصافی پر مبنی دکھائی دیتا ہے اس لئے کہ عام آدمی یہ سمجھتا ہے کہ نیتن یاہو حکومت نے امن کو منجمد کر دیا ہے اور یہ کہ امریکہ اپنے اثرات کو اب اسرائیل پر دباؤ ڈالنے کے لیے اصرار نہیں کر رہا ہے۔ عراق پر جو پابندیاں عائد ہیں اس کا صرف یہ مقصد نہیں کہ ایک آمر کو لگام دی جائے یا اسے عام تباہی کے اسلحوں سے روکا جائے بلکہ اس کا سیدھا مطلب پوری عراقی قوم کو سزا دینا ہے۔ اس لیے کہ عراق میں آج عام لوگ انتہائی غربت اور افلاس کی زندگی گزار رہے ہیں۔ دواؤں اور غذا کی قلت ہے۔

صدام حسین کو خوب معلوم ہے کہ اس صورت حال سے کیسے فائدہ اٹھایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اس نے دوبارہ عوامی مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ آج صدام حسین ایسی قوت کے طور پر ابھر کر سامنے آرہے ہیں جو ایک عام آدمی کی نگاہ میں امریکی قوت سے ٹکر لینے کی علامت بن گیا ہے۔ مصر کا ٹیکسی ڈرائیور یا شام کے کسی کالج کا طالب علم یا مراکش کا ایک تاجر یہ سب کے سب امریکی پالیسی کے خلاف ہیں اور اسی لیے ان کی ہمدردیاں صدام حسین کے ساتھ ہوتی جارہی ہیں۔



انھیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اسرائیل پر امن کے معاہدوں کے اطلاق کے لئے تو کوئی دباؤ نہیں ڈالا جاتا لیکن عراق پر دباؤ ڈالنے کے لئے بمباری کی دھمکی دی جاتی ہے اور وہ بھی ان فرضی اسلحوں کو برباد کرنے کے لئے جن کا سات سالوں کے بعد باقی رہ جانے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

جو عرب ریاستیں امن کے ذریعے علاقے میں استحکام کی توقع کرتی تھیں، انھیں اب ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ کسی اندھی گلی میں پھنس گئی ہوں۔ امن معاہدہ منجمد ہوچکا ہے۔ علاقائی ترقی کے منصوبے سراب معلوم ہوتے ہیں۔ اسی کے ساتھ اسرائیل مخالف جذبات عوام میں بڑھتے جارہے ہیں اس لئے اب عرب حکومتوں کے لئے اپنے اندرونی مخالفین کو قابو میں کرنا بھی آسان نہیں کجا کہ وہ اسرائیل کی طرف نرم رویے کا مظاہرہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ اکتوبر میں قطر میں ہونے والی معاشی کانفرنس اسرائیل کے ساتھ عرب ملکوں کو بٹھانے میں ناکام رہی۔ تقریباً تمام ہی عرب ملکوں نے اس کانفرنس کا بائیکاٹ کیا۔

دوسری طرف تنظیم اسلامی کی تہران کانفرنس شاندار کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور پہلی بار ایران کی سرزمین پر امریکہ کی مخالفت کے باوجود تمام عرب ممالک ایک فورم پر نظر آئے جو لوگ قطر میں اسرائیل کے ساتھ بیٹھنے پر آمادہ نہ تھے وہ تہران میں ایران کے ساتھ خوش خوش بیٹھے نظر آئے۔ اس سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ اب علاقائی سیاست میں اسرائیل اور امریکہ ایک طرف ہیں تو دوسری طرف بیشتر عرب ممالک ایران اور عراق ہیں۔ آج کی صورت حال کا اگر 1990ء کی صورت حال سے مقابلہ کیا جائے جب صدام کے خلاف اتحادیوں نے محاذ بنالیا تھا تو حیرت ہوتی ہے

آج اگر عراق پر دوبارہ بمباری کی گئی تو بیشتر عرب دار الحکومت اسے آسانی سے قبول نہیں کریں گے حتی کہ وہ لوگ بھی جو امریکہ کے پرانے حلیف ہیں اور جو خلیجی جنگ میں اس کے ساتھ رہے ہیں۔ پھر 1991ء میں امریکہ کو جو جنگی سہولتیں حاصل تھیں وہ بھی موجودہ صورت حال میں حاصل نہ ہو سکیں گی۔ امریکہ کے بمبار جہاز کو بہت سے ہوائی اڈوں کے استعمال کی سہولت حاصل نہ ہوگی۔ اس لئے امریکی صدام حسین کے خاتمے کا جو منصوبہ عرب ہوائی اڈوں کے استعمال کی بنیاد پر بنا رہا ہے وہ بھی محض ایک خواب ثابت ہوگا۔

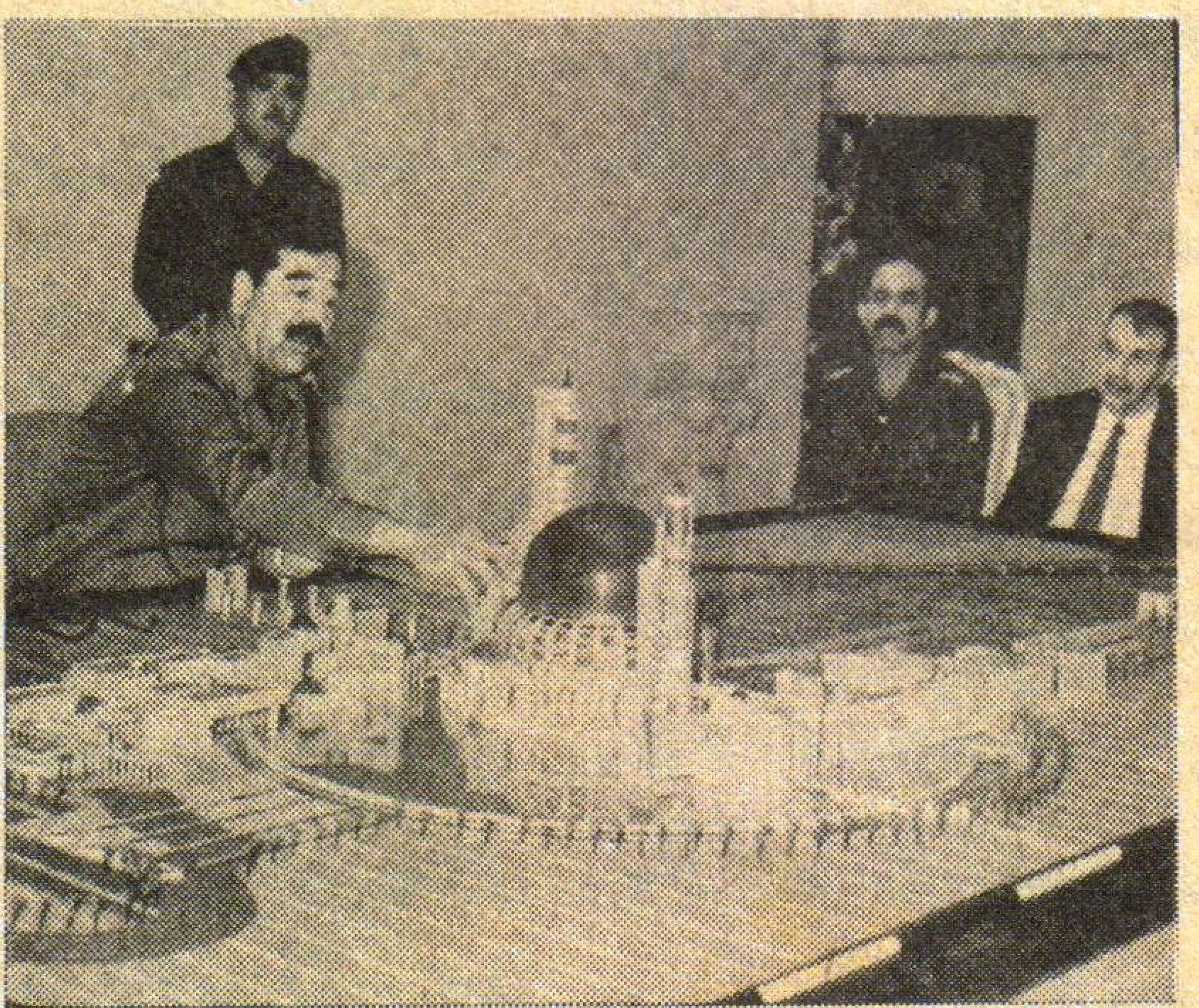
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عراقی اسلحوں کے مکمل خاتمے کے بجائے بعض عرب ممالک عراق کی حمایت میں نکل آئیں اس لئے کہ آج کی صورت حال میں صدام ایک ایسے آدمی کا نام ہے جو اپنی ساری پریشانیوں کے باوجود ایک بڑی قوت سے ٹکر لے رہا ہے اور اس بات کا امکان تو یقینا ہے کہ کل کے مقابلے میں صدام کو موجودہ صورت حال میں شکست دینا خاصہ مشکل ہے۔ وہ جب چاہے گا اپنے اسلحہ خانوں کی جانچ رکوا دے گا اور پابندیوں کی خلاف ورزی کرے گا اور امریکہ اپنے عرب اور یورپی حلیفوں کو یہ یقین نہیں دلا پائے گا کہ وہ جو کچھ کررہا ہے وہ صحیح ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ عراق کو تمام دنیا سے کاٹ کر تنہا کرنے کے بجائے امریکہ خود کو تنہا محسوس کرے گا اور شاید صدام حسین کی بھی یہی خواہش ہوگی۔ □

عراق میں اسلام لوٹ رہا ہے

ملک بھر میں عوامی بیداری کے پیش نظر ریاستی پالیسی بھی اسلامی ہوتی جارہی ہے

زیادہ نہیں کوئی دس سال کی بات ہے جب عراق میں مغرب زدگی اپنے عروج پر تھی۔ سڑکوں اور بازاروں سے گزرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ کوئی مسلمانوں کا ملک نہ ہو بلکہ یورپ اور امریکہ کی تہذیبی کالونی ہو چھوٹے اسکرٹ اور لہراتی بل کھاتی زلفیں فیشن کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ ہر شخص مغرب کی نقالی میں مصروف تھا۔ پاپ میوزک کے ٹرم ڈرم اور رقص و سرور کی ہاؤ ہو میں کسی کو اس بات کا خیال بھی کم ہی آتا تھا کہ بغداد جسے مغرب نے اپنے شکنجے میں کس لیا ہے کبھی خلافت اسلامی کا دار الحکومت ہوا کرتا تھا۔

صورت حال یہ تھی کہ خیر و شر کی تمیز مٹ گئی تھی، حلال و حرام کی تفریق نے اپنے معنی کھو دیے تھے، ترقی کے نام پر بازاروں میں مغرب سے برآمد کردہ اشیاء کی بہتات تھی۔ بات یہاں تک جا پہنچی تھی کہ مسلمان علی الاعلان محرمات کے ارتکاب سے نہیں چوکتے تھے۔ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے ایک سابق استاد جو بصرہ میں ان دنوں انگریزی کے پروفیسر تھے، ان کا کہنا ہے کہ ایک مرتبہ وہ اپنے چند احباب کے ساتھ شہر بصرہ سے باہر آبادی سے دور نکل گئے۔ دھوپ سخت تھی اور گرمی کے مارے ان کا حال برا تھا۔ لوٹتے لوٹتے جب پیاس کی شدت برداشت سے باہر ہو گئی تو ان لوگوں نے سوچا کہ مسلمانوں کا ملک ہے اور قریب ہی صاف ستھرے مکانات کا سلسلہ ہے کیوں نہ ان میں سے ہی کسی کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے۔ گھنٹی بجائی، ایک ادھیڑ عمر کا عراقی مسلمان باہر آیا، سلام کے تبادلے کے بعد اس نے بڑی خوش اخلاقی سے اندر آنے کی دعوت دی۔ ان لوگوں نے اپنی آمد کا مقصد بتایا، زحمت کے لیے معذرت کی اور کہنے لگے کہ سخت گرمی کے باعث پیاس سے برا حال ہے، ہماری بوتلوں میں پانی ختم ہو چکا ہے اس لیے آپ کو زحمت



☆ صدام حسین: مسجد کے ماڈل کا معائنہ کرتے ہوئے

دی شاید آپ کے یہاں پانی مل سکے۔ ایک لمحے کے لیے میزبان نے سکوت اختیار کیا اندر گیا اور ٹرے میں بیئر کی بوتلیں اور گلاس اٹھا لایا، کہنے لگا معاف کیجئے گا پانی تو اس وقت دستیاب نہیں البتہ بیئر موجود ہے اور وہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ قدرے توقف کے بعد مہمانوں نے کہا، معاف کیجئے گا ہم لوگ مسلمان ہیں۔ میزبان کہنے لگا، ارے تو اس میں کیا بات ہوئی آخر ہم لوگ بھی تو الحمدللہ مسلمان ہیں۔ استاد محترم کہتے ہیں کہ وہ اس بات پر ششدر رہ گئے کہ آخر یہ کیسے مسلمان ہیں جن کے یہاں حلال و حرام کی تمیز ختم ہوگئی ہے۔ انھوں نے بہت بہت شکریہ ادا کیا اور عالم حیرانی میں اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔

لیکن اب اسی عراق میں جہاں کل تک بعث پارٹی کے کمیونزم نے مسلمانوں کے دماغ کو مسحور کر رکھا تھا اور جہاں اسلام کے احیاء کی بات کرنے والوں کو دقیانوس اور بنیاد پرست سمجھا جاتا تھا، آج اسی ملک میں صورتحال یکسر بدل چکی ہے۔ سوویت یونین کے زوال کے بعد عام مسلمانوں نے یہ محسوس کیا ہے کہ وہ اب تک کمیونزم کے نام پر ایک سراب کے پیچھے بھاگتے رہے ہیں۔ خود حکومت کی سطح پر اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اب اگر حکمرانی کو طول دینا ہے تو اسلام کا سہارا لینا ہوگا۔ 1991 کی خلیجی جنگ میں اسی عوامی دباؤ کے تحت صدام حسین نے عراقی جھنڈے پر اللہ اکبر لکھ ڈالا اور وہ پوری جنگ کو اسلام اور کفر کی معرکہ آرائی باور کراتے رہے اور اب ملک بھر میں اسلامی بیداری کی لہر سے خود کو ہم آہنگ کرنے کے لیے مختلف اسلامی پروگرام تشکیل دیے گئے ہیں جس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ عوام کو یہ باور کرایا جاسکے کہ عراق کی حکمراں جماعت اسلامی بیداری کی تحریک کو آگے لے چلنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔

صدام حسین ہی نہیں خلیج کے تمام حکمراں اب اس بات کو شدت سے محسوس کررہے ہیں کہ اگر انھیں اپنی کرسیاں بچانی ہیں تو انھیں اسلام کا چیمپین بننا ہوگا ورنہ عرب ممالک میں اسلام کی طرف واپسی کے لئے جو زبردست تحریک چل رہی ہے اس کے آگے ان حکمرانوں کا ٹکنا مشکل ہوجائے گا۔

صدام حسین ہی نہیں خلیج کے تمام حکمراں اب اس بات کو شدت سے محسوس کررہے ہیں کہ اگر انھیں اپنی کرسیاں بچانی ہے تو انھیں اسلام کا چیمپین بننا ہوگا ورنہ عرب ممالک میں اسلام کی طرف واپسی کے لیے جو زبردست تحریک چل رہی ہے اس کے آگے ان حکمرانوں کا ٹکنا مشکل ہوجائے گا۔ صدام حسین بھی اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے اب خود کو ایک اسلامی مجاہد کی حیثیت سے پیش کررہے ہیں حالانکہ ان کا پچھلا ریکارڈ بالکل مختلف حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے۔ بعث پارٹی ابتداء سے ہی اسلامی انقلابیوں کے خون کی پیاسی رہی ہے اور دنیا جانتی ہے کہ شام کے حافظ الاسد اور عراق کے صدام حسین کے ہاتھ اسلام کے شیدائیوں کے خون سے رنگین ہیں لیکن اب عوامی سطح پر اسلام کے لیے زبردست جوش و خروش پیدا ہورہا ہے۔ اس کے پیش نظر عرب حکمرانوں کے لیے ایک ہی راستہ رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ اپنے اصل نظریات کو چھپا کر وہ اسلام کے علمبردار کی حیثیت سے خود کو پیش کریں۔

بغداد کے عین قلب میں پچھلے دنوں ایک عظیم الشان صدام مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دنیا کی عظیم الشان مسجدوں میں ایک ہوگی جس میں کوئی 45 ہزار لوگ نماز ادا کرسکیں گے اور اسے ایک مصنوعی جھیل کے عین قلب میں اس طرح بنایا جائے گا کہ ایسا محسوس ہو گویا پوری مسجد جھیل میں تیر رہی ہو۔ عراق کے اندر سرکاری سطح پر اس طرح کی تبدیلی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اب عراقی حکمرانوں نے وقت کی نبض کو سمجھ لیا ہے۔ کل تک جن لوگوں کو سیکولرزم اور سوشلزم پر اصرار تھا آج وہ علی الاعلان خادم اسلام کی حیثیت سے خود کو پیش کررہے ہیں۔

یہ بات بھی حیرت سے خالی نہیں کہ گذشتہ سات برسوں میں عراق کی مذہبی صورت حال میں انقلابی تبدیلی آئی ہے۔ مسجدیں نمازیوں سے بھر گئی ہیں اور نمازیوں میں کثیر تعداد نوجوانوں کی ہے گو کہ عراق میں مسجدوں کی کمی نہیں لیکن اب ہر مسجد نمازیوں کے لیے چھوٹی ثابت ہورہی ہے۔ خلیجی جنگ سے پہلے جس مسجد میں جمعہ کی نماز کے لیے سو لوگوں کا جمع ہونا مشکل ہوتا تھا آج انھیں مسجدوں میں ہزار سے زیادہ نوجوان موجود ہوتے ہیں۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے اکثر صفیں باہر لگانی پڑتی ہیں۔ جن بازاروں میں کھلی ٹانگوں اور لہراتی زلفوں کا ہجوم ہوتا تھا آج انھیں بازاروں میں برقعہ اور جلباب نے فیشن کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ بعث پارٹی کے رہنماؤں کے لیے بھی اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ عوام کے موڈ کو سمجھتے ہوئے ان کی آواز میں آواز ملائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب سرکاری سطح پر بھی اسلامی علامتوں کے فروغ کا کام شروع ہوگیا ہے۔ عراق کی سماجی فضا میں اس حیرت انگیز تبدیلی سے اس خیال کو مزید تقویت ملتی ہے کہ اسلام کی مرکزی سرزمین پر دوبارہ اسلام کی واپسی کے لیے جو تحریک چلائی گئی تھی اور جس کے لیے ہر روز دنیا بھر میں اسلامی انقلابی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کررہے ہیں ان کی کوششیں رائگاں نہیں گئی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عراقی عوام اس علامتی تبدیلی پر ہی اکتفا کرلیتے ہیں یا آگے بڑھ کر ملک کے نظم و نسق کا انتظام صالح قیادت کے ہاتھوں سونپنے کے لیے خود کو ایک فیصلہ کن معرکے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ عراق اور عالم اسلام میں اسلام کا مستقبل بہت کچھ اسی سوال کے جواب پر منحصر کرتا ہے۔ □

کیا میں اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلوں؟

سوال

ماہ و سال کے گزرنے کے ساتھ میری حیرت و پریشانی اور غم و حزن میں اضافہ ہوتا جارہا ہے میں تین بہنوں میں سب سے بڑی ہوں۔ ہم تینوں نے اچھے کالجوں اور یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے اور سند یافتہ ہیں۔ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہم سے شادی کرنے کے مشتاق افراد کے پیغامات آتے تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے والد نے کسی رشتے سے انکار نہیں کیا اور وہ ان پیغامات سے ہمیں مطلع کردیتے تھے جو ان کے کوائف ہوتے تھے ان کی بھی وضاحت کردیتے تھے۔ قبول اور انکار کا فیصلہ ہم پر چھوڑ دیتے تھے۔ جہاں تک میری دو بہنوں کا سوال ہے تو انہوں نے اصولی طور پر شادی سے کبھی انکار نہیں کیا اور انہوں نے شادی کے فیصلہ کے لئے شرعی موقف و معیار کو بنیاد بنایا۔ لیکن میں تھی کہ اس پر اڑی رہی کہ تعلیم سے فراغت سے پہلے شادی نہیں کروں گی اور جب جب بھی پیغام آئے میں نے انکار کردیا۔

میری دونوں بہنوں کی شادی ہوگئی اور اب وہ یونیورسٹی کی طالبات بھی نہیں ہیں۔ وہ اپنے گھروں میں خوش و خرم ہیں اور ایک دو بچوں کی ماں بھی بن چکی ہیں۔

میں نے یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کرلی ہے لیکن اس کے بعد سے پیغامات کا سلسلہ بند ہوگیا۔ اب میں دروازے پر کسی آنے والے کی دستک کا صرف انتظار کرتی رہتی ہوں لیکن شاید اب ادھر کسی کے قدم نہیں اٹھتے اور یہ خاموشی مجھ سے کہتی ہے کہ اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو۔ اب میری عمر تیس سال سے اوپر ہوچکی ہے۔ امید و بیم کے عالم میں میں راہ دیکھتی رہتی ہوں کہ کوئی میرے والد سے مجھ سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کرے گا لیکن ایسا ہوا تو نہیں ہے۔ سب میری تکلیف کو جانتے اور محسوس کرتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ مجھ پر وہ ترس کھارہے ہیں۔ جب میں اپنی بہنوں اور ان کے بچوں سے ملنے جاتی ہوں تو مجھے محرومی کا احساس ہوتا ہے اپنی حالت کا ان کی خوشحالی اور آسودگی سے مقابلہ کرکے۔ صاف الفاظ میں یہ کہہ دوں کہ اب میں خود کو ملامت کررہی ہوں۔ خود کو اس اندھیری کھائی میں گرانے کے لئے میں ہی ذمے دار ہوں کسی اور کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ لیکن اب تو سب کچھ ہوچکا ہے اور پچھلی حالت پر لوٹنے کی کوئی سبیل ہے نہیں۔

اب آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ کیا میرے لئے کوئی امکان ازدواجی زندگی کی خوشی حاصل کرنے کا نہیں ہے اور کیا مصیبتوں اور غموں کی مزید طوالت کے سوا میرے سامنے کوئی اور راستہ کھلنے والا نہیں ہے۔

سلیمہ اعجاز (پونہ)

جواب

آپ کی بات کا جواب سوالنامے کے آخری حصے سے شروع کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ جہاں تک سوال یہ ہے کہ کیا تمام مواقع ختم ہوچکے ہیں۔ اس سوال میں ناامیدی بہت زیادہ غالب ہے جب کہ ہمارا ایمان اس پر ہونا چاہئے کہ لاتقنطوا من رحمۃ اللہ اور اس کی عملی مثالیں چند نہیں بلکہ سیکڑوں ہیں۔ ہر شخص کو نقصان یا فائدہ اسی قدر حاصل ہوتا ہے جتنا اللہ کو منظور ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ آپ ناامیدی کو دل سے جھٹک دیں اور اللہ پر ایمان و یقین کو دل میں جاگزیں کریں اور یہ یقین خالی بیٹھ کر تو پیدا نہیں ہوتا اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اللہ تعالی سے تعلق پیدا کرنا اور اس تعلق کو مضبوط تر کرنا عبادت میں خلوص خشوع و خضوع لاکر اور فرائض و سنن کی پابندی کرکے اور اللہ تعالی کے احکام پر صدق دل سے عمل کرکے۔

آپ جسے کھوئے ہوئے مواقع سے تعبیر کررہی ہیں وہ بھی اللہ کی مصلحت سے خالی نہیں ہے اس لئے مایوسی کی کوئی وجہ آپ کے لئے نہیں ہے کہ اللہ کب کسی نقصان سے بھی فائدے کی راہیں نکال دے اور آپ کو ایک صالح اور دیانتدار شوہر مل جائے۔

ہاں ایک اہم بات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ ہماری بعض بہن بیٹیاں اس عادت میں مبتلا ہیں کہ جب شادی کے پیغامات کی بھرمار کا زمانہ رہتا ہے تو بڑی بے نیازی سے یہ کہہ کر انکار کردیتی ہیں کہ ابھی تو وہ پڑھ رہی ہیں جب تعلیم مکمل کرلیں گی تو اس کے بارے میں سوچیں گی۔ عموماً یہ حجت والدین کی طرف سے پیش کی جاتی ہے گویا کہ یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ وہ تجربہ و مشاہدے میں ہر اعتبار سے زیادہ ہیں اور اس طرح کے معاملات میں صحیح ترین مشورہ یا نصیحت وہی دے سکتے ہیں۔ ہم نے دیکھا یہ ہے کہ تعلیم سے فراغت کی حجت لڑکیوں سے کالج اور یونیورسٹی کی اعلی سے اعلی تر منازل سے ضرور گزارتی ہے لیکن دوسری طرف ان کے شباب کی منزل بھی پیچھے نکل جاتی ہے اور یہی وہ منزل ہے جب رشتوں کے پیغام ہر لڑکی کے لئے آتے ہیں۔

آپ کی چھوٹی بہنوں نے آپ کے مقابلے میں کہیں زیادہ عقلمندی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے صحیح وقت پر شادی کی۔ زندگی کی خوشیاں انہیں حاصل ہیں کوئی مایوسی کوئی پشیمانی نہیں۔ انہوں نے نہ صرف تعلیم حاصل کی بلکہ اپنے گھربار کی بھی ہوگئیں۔ آپ نے فیصلے میں تاخیر کی اور عہد شباب آپ کے لئے عہد رفتہ بن کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ عمر کے تیس سال گزر گئے۔ یقیناً یہ عمر بہت سی لڑکیوں کے لئے فکرمندی کی ہے کیونکہ اس مرحلے پر رشتے کم آتے ہیں۔ شادیاں تو ضرور اس عمر سے تجاوز کرجانے والے لوگوں کی ہوتی ہیں لیکن ایسے افراد کی تعداد ظاہر ہے مقابلۃً خاصی کم ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ بھی یاد رکھنی چاہئے کہ جس قدر عمر بڑھتی جائے گی اسی قدر آپ کی طرف سے شادی کی شرائط کم ہوتی جائیں گی یا آپ کم کرنے پر مجبور ہوں گی۔ یعنی بیس سے پچیس سال کی عمر کی لڑکی کی طرف سے جو شرائط ہوتی ہیں وہ تیس یا پینتیس سال کی لڑکی کی طرف سے نہیں پیش کی جاسکتیں۔ غیر موزوں شرائط پر اصرار کرکے آپ اسی غلطی کا اعادہ کریں گی جو آپ اس سے پہلے دو تین پیغامات کو تعلیم کے عذر سے ٹھکرا کے کرچکی ہیں۔

کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اپنی شرائط کو اس حد تک نرم کردیں کہ ہر شخص کو قبول ہو لیکن ایک مثبت معیار جو شادی کے سلسلے میں کسی لڑکی یا اس کے والدین کو مقرر کرنا چاہئے وہ یہ ہو کہ ایسے لڑکے سے رشتے کے پیغام کو نہ ٹھکرایا جائے جس کی دینداری اور ایمانداری مصدق ہو۔ اور جس طرح کے عذر آج کل لڑکیوں کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں ان سے شادی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی ہوتی ہیں۔ لہذا کبھی یہ کہہ کر پیغام سے انکار کردیا جاتا ہے کہ لڑکا شادی شدہ ہے، ایک بیوی کو طلاق دے چکا ہے یا پہلی بیوی فوت ہوچکی ہے وغیرہ۔ اسی لئے کنواری رہ جانے والی عورتوں کی تعداد بڑھتی رہتی ہے اس پریشانی سے بچنے کے لئے ہمیں چاہئے کہ عملی اور موثر اقدامات کریں اور غیر شرعی امور و شرائط پر اصرار کرکے شادی پر راضی مردوں کے سامنے مسائل نہ پیدا کریں۔

سوال

میرے والد نے بچپن ہی میں میری شادی خالہ کے لڑکے سے کرنے کا ذکر کیا تھا یہ مجھے یاد ہے۔ یہ ایک ایسا رواج ہے جس کی پابندی ہمارے گھرانے میں ہوتی آئی ہے۔ والدین کے درمیان بچوں کی چھوٹی عمر سے ہی معاہدہ ہوجاتا ہے کہ کس کی لڑکی کس کے لڑکے سے اور کس کا لڑکا کس کی لڑکی سے بیاہا جاتا ہے۔ میرے بچپن سے ہی لوگ کہتے رہے ہیں کہ میں اپنی خالہ کے لڑکے کے لئے ہوں۔ اور اب میں نہیں سمجھ پارہی ہوں کہ میں اس کے لئے ہوں اور وہ میرے لئے ہے۔ کیونکہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں اس لئے یہ شادی کسی طرح کامیاب نہیں رہے گی۔ اب میں کروں کیا اگر اس رشتے سے انکار کردوں تو اپنے والد اور پورے خاندان کے غیض و غضب کا نشانہ بنوں اور وہ لوگ ایک طرح سے میرا بائیکاٹ کردیں گے۔

صبوحی فاطمہ (رانچوی)

جواب

آپ کا مسئلہ خاصا تکلیف دہ ہے۔ خصوصاً احکام الٰہی سے غفلت نے اس تکلیف کو اور شدید کردیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان خاندانی روایات اور ضابطوں کے آگے ہیچ ہے شادی کے لئے زوجین کی مرضی کی شق ان والدین نے اپنے حق ملکیت کے زعم میں آکر منسوخ کردی۔ ازدواج اسلام کے نزدیک ایک ایسا عائلی ادارہ ہے جس پر آئندہ نسلوں کی تعمیر کی ذمے داری عائد ہوتی ہے اور اس ادارے کا تحفظ ہمیں بالکل شروع سے ہی کرنا چاہئے اور ایسے تمام اقدامات کرنے چاہئیں جو مسلمان نسلوں کی تربیت و پرداخت کی قدرت و صلاحیت کی ضمانت دے۔ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر والدین یہ فیصلہ کریں کہ جب وہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی کرنے چلتے ہیں تو کیا وہ اس کے آگے کسی اور چیز کو بھی فوقیت دیں گے کہ آنے والی نسلوں کی سلامتی اور فلاح و بہبود کو اپنی پسند اور ناپسند اور برسوں پہلے دی گئی زبان کی آن قائم رکھنے کی خواہش بیجا پر قربان کردیں گے۔

شرعاً یہ بات مناسب نہیں کہ ماں باپ بچپن میں اپنے بچوں کی شادی طے کردیں مبادا کہ آگے چل کر ان کے مزاج کی ناہمواری کی بناء پر اختلافات پیدا ہوں تو ازدواجی زندگی نعمت کے بجائے زحمت بن کر رہ جائے۔ اسلام نے مرد اور عورت، لڑکے اور لڑکی کے درمیان رشتہ ازدواج کے ایجاب و قبول میں خالصتاً ان کی مرضی اور منشا پر اصرار کرکے اسی سماجی پہلو کو ثابت کیا ہے۔ اس لئے منگنی اور شادی کے معاملات میں شرعی ضابطوں اور طریقہ کار پر عمل کرکے ہی ہم اس رشتے کو استحکام بخش سکتے ہیں اور اسے بابرکت بناسکتے ہیں۔

آپ کی پریشانی کے سلسلے میں ایک بات بہت ضروری ہے کہ کوئی ضروری نہیں کہ آپ کی خالہ کا لڑکا آپ کے لئے ناموزوں ثابت ہو آپ اپنے والد سے اس کے بارے میں چھان بین کرکے اس کے حالات و عادات معلوم کریں اور اگر ایک اوسط معیار پر پورا اترتا ہے تو بڑی اچھی بات ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت آپ کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو کہ اس طرح پہلے سے مقرر کئے ہوئے رشتے ناکام ہوتے ہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ لڑکا صالح ہو، دیندار ہو اور آپ کی توقع کے خلاف آپ کی دلجوئی اور آپ سے محبت کرنے والا ثابت ہو اور آپ کے سامنے کوئی اور ترجیحی رشتہ نہ ہو تو اس پر غور کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ صریح انکار کردینا مناسب نہیں۔ اسی طرح والدین کا یہ اصرار کہ شادی ہوگی تو خالہ کے لڑکے سے ہی ہوگی اسلام کے نزدیک ناپسندیدہ بات ہے

سوال

ایک جگہ میں نے پڑھا تھا کہ شوہر کے تئیں بیوی کی خدمت گزاری اصلاً بیوی پر واجب نہیں اور اس کے عقد زواج میں محض لطف اندوزی شامل ہے اور جو خدمت وہ شوہر کی کرتی ہے اس کا شمار حسن معاشرت میں ہوگا۔ شوہر پر لازم ہے کہ وہ اپنی بیوی کے لئے خدمتگار فراہم کرے چاہے وہ ان سے خدمت نہ لے اور اپنے کام خود ہی انجام دے۔

رشیدہ خاتون (دہلی)

جواب

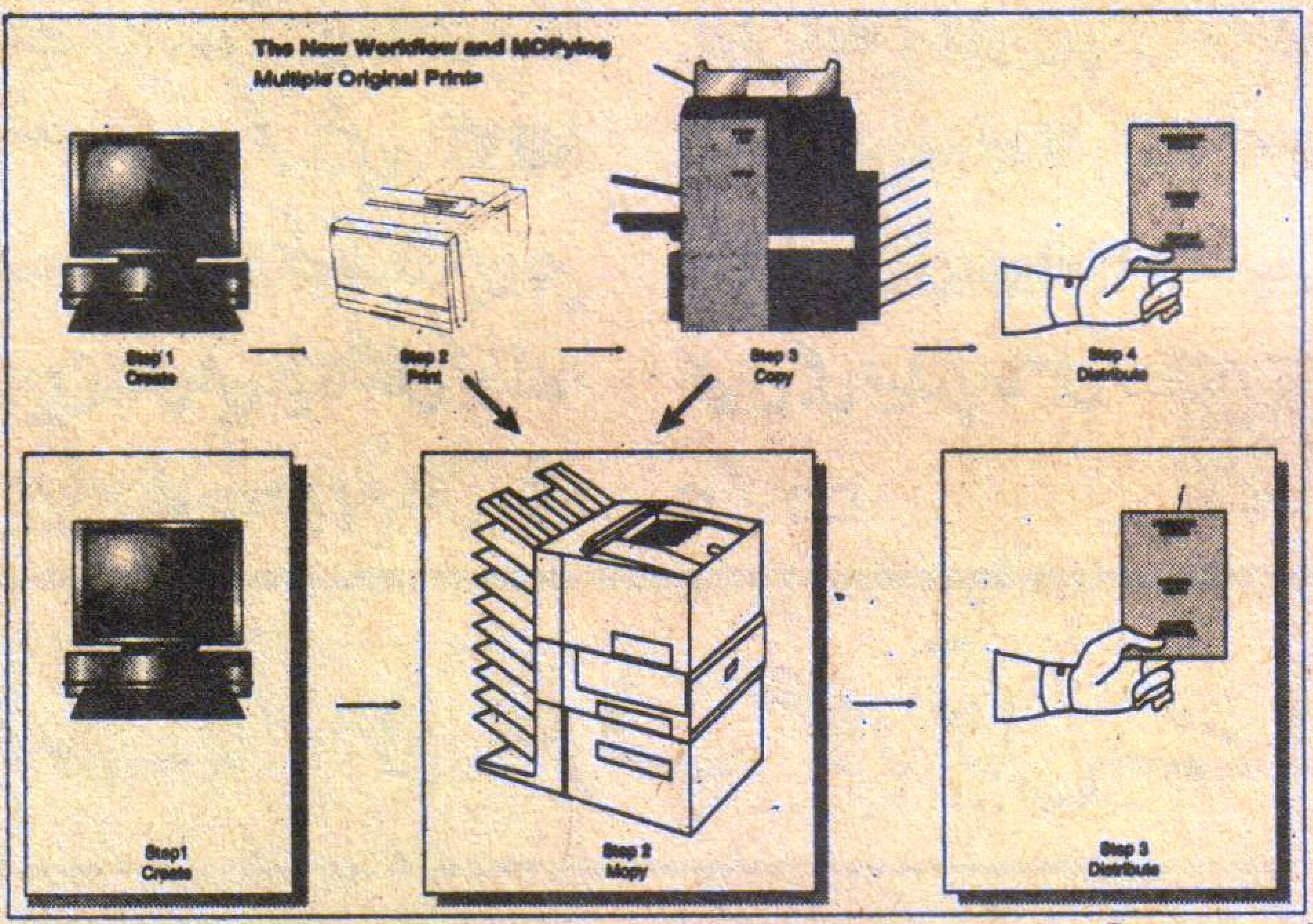
یہ بات درست نہیں ہے اور نہ ہی اس پر عام طور پر عمل ہوتا ہے۔ صحابیات تک نے اپنے شوہروں کی خدمت کی ہے۔ اسماء بنت ابوبکر نے اپنے شوہر زبیر بن عوام کی خدمت کی، فاطمہ زہرا نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت کی۔ دنیا کے بیشتر اور خصوصاً مسلم معاشروں میں یہ روایت چلی آرہی ہے کہ بیویاں شوہروں کی خدمت کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر کھانا پکانا، برتن اور کپڑے دھونا اور فرش کی صفائی کرنا، جانوروں کو پانی پلانا اور انہیں دوہنا اور یہ سارے کام ایسے ہیں جو عہد نبوی سے آج تک برابر عورتیں انجام دیتی رہی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان امور میں عورت کی طاقت، صلاحیت، صحت اور فرصت جیسے عوامل کو ہمیشہ مد نظر رکھا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ مرد آرام سے یہ سارے کام عورت کو کرتے ہوئے دیکھتا رہے گا۔ بلکہ حسب ضرورت بیوی کا ہاتھ بٹائے گا جس کی مثال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر کے کاموں میں ازواج مطہرات کا ہاتھ بٹا کر قائم کی۔ □

پہلے بانٹو بعد میں چھاپو

نئی ٹکنالوجی اب ہر دفتر کو چھاپہ خانے میں تبدیل کردے گی

تو بھی ایک ایک کمپیوٹر سے جڑے اندازے کے مطابق سال بھر میں آفس کاپی مشینوں اور ہوئے پرنٹروں سے اخبار، کیٹیلاگ، میگزین، کتابوں اور فارموں کی شکل میں 1۔12 ٹریلین کاغذ کی شیٹیں نکلی ہوں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں معلومات کے حصول اور ترسیل میں کاغذ کا ہی استعمال ہوتا ہے اور صرف دس فیصد معلومات عددی نظام (Device Digital) کے تحت محفوظ کی جاتی ہیں۔ 2004ء تک اس میدان میں ایسی ترقی ہونے والی ہے کہ ستر فیصد معلومات کو عددی نظام کے ذریعے محفوظ کیا جاسکے گا لیکن کاغذ کا استعمال اپنی جگہ پر باقی رہے گا۔ عالمی معلوماتی بینک یعنی انٹرنیٹ سے فائدہ اٹھانے والوں کے لئے یہ بات خاصی تشویشناک ہے جو موصولہ اطلاعات کی کاپیاں آئندہ استعمال کی امید میں محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ پھر ایک مشاہدہ یہ بھی ہے کہ دس صفحات پر مشتمل دستاویزات کی عموماً پانچ یا سات کاپیاں لوگوں کو درکار ہوتی ہی ہیں۔ یہیں سے امریکی ہنرمندوں کو یہ نکتہ مل گیا کہ لیزر پرنٹر یا انک جیٹ پر کوئی دستاویز نکلوانے اور پھر اس کی مزید کاپیاں بنوانے کے لئے جو اصل کے مقابلے میں دھندلی ہوتی ہیں کاپیر تک جانے کی دوہری زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ سارے کام ایک ہی مشین پر کیوں نہ کرلئے جائیں۔ اس طرح جو مشین انہوں نے بنائی اسے کاپیئر کے بجائے ماپیئر کا نام دیا جس میں کاپیئر کے استعمال کا مرحلہ ختم کردیا گیا اور خوبی یہ کہ اس میں ایک سے زائد دو رنگی چھپائی والے دستاویز اصل نسخے کی شکل میں نکالے جاسکتے ہیں۔ Multiple Original Prints کے تصور نے ہی اس مشین کو ماپیئر کا نام دیا ہے۔

کمپیوٹر پرنٹر کی دنیا میں معروف نام ہیولٹ پیکارڈ نے اپنی Laser Jet 5si کو نئی شکل دے کر نیٹ ورک میں استعمال ہونے والے ہیوی ڈیوٹی پرنٹر بنا دیا ہے جس کا نام Mopier 5si رکھا گیا ہے جو ایک منٹ میں چوبیس صفحات نکالتا ہے اور جس کی آن بورڈ میموری بارہ میگا بائٹ ہے۔ امریکہ کے بازاروں میں اس کی قیمت 9500 ڈالر تھی اور باقی پرنٹر بھی اسی کے آس پاس ہوتے ہیں لیکن کاپی کی قیمت کے اعتبار سے یہ کسی بھی ڈیجیٹل پرنٹر سے سستا ہے کیونکہ اس میں ایک کاپی کی لاگت 60 پیسے آتی ہے۔ چھاپنے، کاپی کرنے اور تقسیم کرنے کے عمل پر پھیلے ہوئے روایتی نظام سے چھٹکارا پانے کے لئے بھی ماپیئر کی خدمات کا سہارا لینا مفید سمجھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی کو دوسرے شہر میں سیمینار کرنا ہے تو روایتی طریقے کے مطابق وہ اپنے صدر دفتر میں پرسنل کمپیوٹر پر کورس میٹیریل تیار کروائے گا



یعنی سیمینار کا موضوع اس کے اغراض و مقاصد اس میں زیر بحث لائے جانے والے ذیلی عنوانات، شرکت کی شرائط وغیرہ۔ پھر کاپیئر پر اس کی پچاس کاپیاں بنائی جائیں گی تاکہ ہر مندوب کو دی جاسکے اور اس سے پہلے وہ کاپیاں ہوائی یا بری ذرائع سے سیمینار کی مجوزہ جگہ تک پہنچائی جائیں گی تاکہ سیمینار شروع ہوتے ہی وہ تقسیم کردی جائیں۔ موجودہ "پہلے بانٹو بعد میں چھاپو" کے تناظر میں اسی عمل کی ترتیب نہ صرف بدل جائے گی بلکہ آسان بھی ہوجائے گی۔ یعنی یہ کہ پہلے وہی کورس میٹیریل برقی ذرائع سے سیمینار کے مرکز کو منتقل کردیا جائے گا اور اس کے علاوہ بھی جہاں کہیں ضرورت ہوگی۔ پھر سیمینار کے مرکز پر نصب ماپیئر سے مربوط پرسنل کمپیوٹر کے ذریعے اس میٹیریل کی مطلوبہ کاپیاں نکال لی جائیں گی۔ ایسا ہی ایک سیمینار حال ہی میں ہیولٹ پیکارڈ نے لاس اینجلز میں کیا تھا۔ کمپنی کی دنیا بھر میں واقع مختلف شاخوں سے آئے ہوئے نمائندے اپنے پروجیکشن سلائڈ اور لیکچر نوٹس کی فلاپی ڈیسک لے کر آئے تھے سیمینار ہال کے نزدیک ایک چھوٹا سا دفتر قائم کیا گیا۔ اور Transparancies اور ہارڈ کاپی دونوں کو ایچ پی۔ پی سی Wepier میں داخل کردیا گیا۔ سیمینار کے دوران جب کوئی نیا نکتہ سامنے آتا تو اسپیکر پرسنل کمپیوٹر تک آکر اسی دن تقسیم کرنے کے لئے کچھ نئے صفحات نکال لیتا تھا۔ اس طرح ایک تو کاغذ

کی بچت ہوئی اور سیمینار کے تمام شرکاء کے لئے کورس میٹریل کی اصل بے داغ کاپیاں فراہم ہوگئیں۔

ملٹیپر کے تصور نے زیروکس، کانن، رکوہ، مینولٹا جیسی کاپیئر ساز کمپنیوں کو مہمیز لگائی۔ ابھی تک کاپیئر اور پرنٹر دونوں کے بازار الگ الگ تھے۔ اب ان میں قربت اور اتصال کے آثار پیدا ہوئے۔ "آفس نیبرز" نام کی فرم نے کاپیئر سے سمجھوتہ کیا تو "کمپیوٹر سنر نیبرز" نے پرنٹر خریدے۔ کاپیئر ساز کمپنیوں کو اپنی مشینیں بیچنے سے زیادہ کرائے پر دینے میں زیادہ فائدہ نظر آرہا ہے اور یہ کرایہ فی کاپی کی شرح سے ہوتا ہے۔

پرنٹر کلچر کے مقبول ہوتے ہی کاپیئر سازوں میں بھی بیداری آگئی۔ زیروکس نے اپنی مشین ڈاکومنٹ سینٹر 220 اور 230 کو کچھ ایسا بنادیا ہے کہ اس میں ایک Basic Digital Copier لگا کر نہ صرف پرنٹنگ بلکہ فیکس اور اسکیننگ کی بھی سہولت فراہم کردی ہے۔ ان مشینوں کی قیمت بھی آٹھ سے دس ہزار ڈالر ہے۔

زیروکس آئندہ سال تک چالیس پرنٹ فی منٹ والے نئے ملٹیپر بازار میں لانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ایکوہ اس دوڑ میں کیوں پیچھے رہتا ہے اس نے بھی اپنے کاپیئر کو پرنٹر اور فیکس سے آراستہ کیا اور پھر یہ طریقہ بہت سے دوسرے مشین سازوں کو بھی لبھانے لگا۔ برادر انٹرنیشنل کمپنی نے ایک سکس ان ون کلر مشین MFC 70000 FC پیش کی ہے جس میں پرنٹنگ، کاپینگ، اسکیننگ، پلین پیپر فیکسنگ، پی سی بیسڈ فکسنگ اور میسج سینٹر سبھی چیزیں شامل ہیں۔ یہ ڈیجیٹیل کیمرے، ٹی وی سیٹ، لیزر ڈسک پلیر یا کمکورڈر ٹائپ ویڈیو کیمرے سے ویڈیو فریموں کو بھی اپنی گرفت میں لے سکتی ہے۔ اسی طرح زیروکس نے بھی ملٹی فنکشن مشین۔ ڈاکو مینٹیشن سینٹر 450C بنائی جس میں ایک ساتھ کلر پرنٹنگ، فیکس، کلر کاپینگ اور اسکیننگ کی خصوصیات موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ملٹی فنکشن مشینیں جن کی قیمت امریکی بازار میں پانچ سو سے ایک ہزار ڈالر کے درمیان ہیں ان ضرورتوں کو پورا نہیں کرتیں جن کے لئے ملٹیپر مشینیں بنائی گئی ہیں جو کہ مکمل لیزر پرنٹر ہیں۔ اگرچہ وہ مونوکیروم ہیں اور ان کی قیمت دس ہزار ڈالر ہے تاہم ان کی قیمت رفتہ رفتہ گر رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک اچھا لیزر پرنٹر کچھ دنوں بعد 350 ڈالر میں آنے لگے گا۔

پرنٹر کے خریداروں کو رنگوں کے تنوع سے کتنی دلچسپی ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں اس لئے وہ ملٹیپر کی طرف ضرور متوجہ ہوں گے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دو کے بجائے 256 رنگوں کے ملٹیپر کو کہیں زیادہ مقبولیت ملے گی بشرطیکہ وہ معقول قیمت پر دستیاب ہو اور یقیناً پرنٹنگ انڈسٹری ان امکانات پر غور کر رہی ہوگی۔

اس دوران ہیولٹ پیکارڈ نے ایک ایسی مشین بنانے کا بیڑا اٹھایا ہے جس میں پی سی کے بجائے ٹی وی اسکرین ہی کافی ہوگا۔ یہ مشین ہے ٹی وی 670 Desk Jet جو ٹی وی پر مبنی انٹرنیٹ ACCESS سسٹم کے تحت وجود میں آئی انٹرنیٹ سے رابطہ قائم کر کے تفصیلات کو ٹیلی ویژن سیٹ پر دیکھا جاسکتا ہے۔ 229 ڈالر میں ٹی وی Web کے شیدائی اپنی دلچسپی کی تفصیل کی صاف سیاہ و سفید کاپیاں بھی نیٹ پر حاصل کرسکتے ہیں جس کے لئے صرف ٹی وی 670 کو آن کرنا ہوگا۔ ▭

عفت و عصمت کا تصور صرف عورتوں سے وابستہ نہیں

آپ کے سوال اور ان کے فقہی جواب

سوال کیا کسی بیٹے کے لئے اپنے باپ کی نافرمانی جائز ہے اس صورت میں کہ مؤخر الذکر اسے تعلیم اور پڑھائی کی دہائی دے کر شادی سے روکے اور کیا یہ جائز ہے کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کو شادی کرنے کی غرض سے زکوۃ دے۔

میاں عبدالرحیم (مالیر کوٹلہ)

جواب اگر بیٹا ایسی حالت میں باپ کی نافرمانی کر رہا ہے کہ وہ اسی سے کہے کہ اس کی شادی کردے اور باپ اس پر راضی نہ ہو۔ یہ وہ مخصوص معاملات ہیں جس کا تعلق ذاتی طور پر فرد سے ہوتا ہے اور والد کی ممانعت کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے اور نہ ہی باپ کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی شادی کی راہ میں رکاوٹ بنے۔ بلکہ واجب یہ ہے کہ اگر بیٹا شادی کے اخراجات اٹھانے کی



سکت نہ رکھتا ہو تو باپ اپنے پیسے خرچ کر کے اس کی شادی کرائے۔ تو جب وہ بیٹا اپنے باپ سے کہے کہ میں شادی کا خواہشمند ہوں اور میرے پاس مال و دولت نہیں ہے تو باپ کو چاہئے کہ اپنی طرف سے مال خرچ کرے۔ یہاں تک کہ اگر ایک بیوی سے اس کی تشفی نہیں ہوئی تو بیٹے کا یہ مطالبہ چار بیویوں کی حد تک قابل تسلیم سمجھا جائے گا۔

بہرحال یہ باپ پر واجب ہے کہ اگر وہ متمول ہے تو وہ اپنے مال سے اپنے

بیٹے کی عفت و پاکیزگی کا اہتمام کرے اور اگر بیٹا شادی سے انکار بھی کرے تو بھی وہ ہر طرح اسے مجبور کرے کہ وہ شادی کرلے اور اپنے لئے فسق و فجور کے دروازوں کو کھلا نہ رکھے۔ اور جب شرعی حکم کا اصرار اس جبلی ضرورت کی تکمیل پر حد درجہ ہے تو باپ کے اس عمل کو مستحسن کیسے سمجھا جاسکتا ہے کہ اپنے بیٹے کو شادی کرنے سے روک دے یہ کہہ کر کہ ابھی اس نے اپنی تعلیم مکمل نہیں کی ہے۔ یہ تصور بھی غلط ہے کہ شادی تعلیم کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔ حالانکہ خواہ لڑکا ہو یا لڑکی اگر وہ شرعی حدود کے اندر زندگی گزارنے پر راضی ہوں اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوں تو اس سے ایک دوسرے کو تعاون حاصل ہوتا ہے۔ فرض کرلیجئے کہ دونوں ابھی تعلیم کے مرحلے میں ہیں تو بھی ایک دوسرے کو مطالعے میں مدد دے سکتے ہیں اور اس طرح دونوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

باپ کا بیٹے کی شادی کی راہ میں حائل نہ ہونے کا نکتہ یہاں بہت اہم ہے۔ کیونکہ اگر اپنی جسمانی ضرورت سے مجبور ہو کر بیٹا غلط راہ پر چل نکلا ناجائز جنسی اختلاط میں ملوث ہوگیا تو اس کی ذمہ داری باپ پر بھی عائد ہوگی اور یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ عفت و عصمت کا تصور ہمارے معاشرے میں صرف عورتوں سے غلط طور پر وابستہ کرلیا گیا ہے۔ جس طرح ایمان و عمل کی شرائط کا اطلاق مرد اور عورت دونوں پر ہوتا ہے اسی طرح عفت و پاکیزگی پر قیام دونوں کی طرف سے یکساں طور پر درکار ہے۔ عصمت کے تصور کو عورتوں کے ساتھ مخصوص کرنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ معاشرے میں بے راہ روی بڑھی ہوئی ہے۔ اسلام نے اس بنیادی نکتے کو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور اسی لئے رشتہ ازدواج کو مرد اور عورتوں دونوں کی عفت و پاکیزگی کے تحفظ کا ذریعہ بنایا۔

سوال۔ کیا کسی کے لئے جائز ہے کہ کسی مرض سے شفا پانے کی غرض سے دئے گئے تعویذ کی اجرت طلب کرے؟ رفیق عالم (پٹنہ)

جواب۔ اگر وہ تعویذ شرعی حدود سے تجاوز نہ کرتا ہو۔ نہ ہی تعویذ دینے والے اور نہ تعویذ استعمال کرنے والے کی یہ نیت ہو کہ بعض تکلیفوں سے آرام حاصل کرنا اس کا مقصد ہے نہ کہ کوئی اور منافع حاصل کرنا۔ دوسرے یہ عقیدہ بھی دونوں کا ہو کہ شفا دینے کی قدرت بذات خود اس تعویذ میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے تو اس تعویذ کو دینا اور اس کی کچھ اجرت لینے میں مضائقہ نہیں۔ احادیث سے ثابت ہے کہ جبریل علیہ السلام نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دم کیا تھا اور اسی طرح بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی اجرت کے بدلے بعض ضرورت مندوں پر دم کیا۔ ابو سعید الخدری سے روایت ہے کہ ایک بار صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی ایک جماعت سفر میں تھی۔ ان میں سے ایک صحابی نے کسی عرب قبیلے کے سردار کو دم کیا جسے سانپ نے کاٹا تھا اور اس کے لئے انہوں نے اجرت مقرر کی تھی۔ تو اہل قبیلے نے ان صحابی کو چند بکریاں دیں۔ ان صحابی نے ان بکریوں کو اس وقت تک استعمال نہیں کیا جب تک کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع نہ کردی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دم کرنے کی اجرت قبول کرنے کی اجازت دے دی۔

یہاں پر دم اور دعا تعویذ کو شرعی حدود میں رہتے ہوئے کرنے پر تاکید ہے۔ گویا کہ اس میں سفلی اعمال کی گنجائش نہیں ہے جس میں غیر اللہ سے مدد طلب کی جاتی ہے اور انہیں حاجت روا تصور کیا جاتا ہے اور بعض ایسے اعمال کئے جاتے ہیں جس میں دوسرے انسان کو نقصان ہو یا اسے تکلیف پہنچے۔

> جس طرح ایمان و عمل کی شرائط کا اطلاق مرد و عورت دونوں پر ہوتا ہے اسی طرح عفت و پاکیزگی پر قیام دونوں کی طرف سے یکساں طور پر درکار ہے۔ عصمت کے تصور کو مردوں کے ساتھ مخصوص کرنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ معاشرے میں بے راہ روی بڑھی ہوئی ہے۔ اسلام نے اس بنیادی نکتے کو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور اسی لئے رشتہ ازدواج کو مرد اور عورتوں دونوں کی عفت و پاکیزگی کے تحفظ کا ذریعہ بنایا

سوال۔ میرے والد نے اپنی تمام دولت اور جائیداد وصیت کے ذریعے صرف بیٹیوں کے نام کردی ہے۔ شرعی نقطہ نظر سے ان کے اس عمل کی کیا حیثیت ہے؟ حیدر علی (بہرائچ)

جواب۔ ایک تہائی مال و جائداد سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں ہے اور اس میں وارث کا تصرف باقی ورثاء کی اجازت کے بغیر جائز نہیں۔ اس لئے پوری دولت اور جائداد کی وصیت درست نہیں ہے اور کسی غیر وارث کے لئے بھی اس میں سے ایک تہائی سے زیادہ مخصوص نہیں کی جاسکتی۔ جہاں تک سوال ہے اس کا کہ کوئی بیٹا نہ ہونے کی صورت میں شخص مذکور نے پوری جائداد بیٹیوں کے نام کی تھی تو اس میں یہ تصدیق ضروری ہے کہ اس نے ایسا پوری طرح عقل و ہوش کی حالت میں کیا تھا۔ انسانی حقوق کا تحفظ اسلام نے اپنے ہاتھ میں اس طرح لیا ہے کہ کہیں سے ایک کی حق تلفی اور دوسرے پر بیجا نوازش کا خانہ ہی نہیں رہ جاتا۔ ورنہ اس معاملے کو افراد کی اپنی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا۔ اور اگر کوئی شخص اپنی اولاد میں سے صرف ایک کو یا بیٹوں یا بیٹیوں میں سے صرف بیٹیوں کو یا صرف بیٹوں کو اپنی جائداد کا وارث بنانا چاہتا تو اس میں کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ لیکن یہاں رشتوں کے تقاضوں کو مقدم رکھا گیا ہے اور ان کو قائم و دائم رکھنے کے لئے۔ افراط و تفریط سے بچانے کے لئے وراثت اور ازدواج جیسے اداروں اور ضابطوں کی تشکیل کی ہے جسے ہم آج اپنی کم علمی کی بنا پر انسانی کمال سے تعبیر کرتے ہیں۔ ▭

مجبوری کے ہاتھوں میں اپنا گردہ بیچنا چاہتا ہوں

للہ بتائیے میں کیا کروں؟

اگر آپ کسی الجھن میں ہیں یا کسی اہم مسئلے پر فیصلے لینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جس سے آپ کی زندگی کا سکون درہم برہم ہوگیا ہے تو آپ فوری طور پر ہمیں اپنے مسائل سے آگاہ کریں۔ ہم اس کالم میں آپ کی نفسیاتی الجھنوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

سوال میرا بیٹا بیس سال کی عمر کا ہے اسے ہڈیوں کا کینسر ہوگیا ہے۔ ہم نے اب تک بہت سے علاج کرائے ہیں اور ریڈیو تھراپی بھی ہوئی ہے لیکن کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا کچھ دنوں تک ایسا محسوس ہوا کہ مرض ایک جگہ ٹھہر گیا ہے لیکن پھر عود کر آیا۔ میں نے سنا ہے کہ قرآنی اعمال اور بعض جڑی بوٹیوں سے بھی امراض کا علاج ہوتا ہے۔ اب ہمارے لئے یہی ایک سہارا باقی بچا ہے اس لئے میں کسی ایسے شخص کی تلاش میں ہوں جو میرے بیٹے کا علاج کرسکے۔ حلیمہ سعدیہ (رامپور)

جواب سرطان ان چند امراض میں سے ہے جس کے شافی علاج کی تلاش میں سائنسداں اور ڈاکٹر برابر سرگرداں ہیں اور کسی حد تک انہوں نے بعض اقسام کے سرطان کا علاج دریافت بھی کرلیا ہے۔ مثلاً جلد، خون، سینے اور جگر کا سرطان۔ سرطان کے آثار انسانی جسم میں یوں تو کہیں بھی نمودار ہوسکتے ہیں۔ ان سے ایک خلیہ متاثر ہوسکتا ہے اور خلیوں کا پورا مجموعہ بھی۔ جلد کے کینسر پر تو اللہ کے فضل سے ڈاکٹروں نے قابو پایا ہے اور اسی طرح سینے کے کینسر کے علاج میں بھی پیش رفت ہورہی ہے۔ اپنی ہلاکت کی وجہ سے کینسر کا لفظ جسم میں خوف کی لہر سی دوڑا دیتا ہے۔ لیکن جس طرح دیگر امراض کی دوائیں ہیں اسی طرح کینسر کی بھی ہیں یہ الگ بات ہے کہ ابھی تک ہماری پوری طرح رسائی ان تک ہو نہیں پائی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ان اللہ عزوجل لم ینزل داء الا انزل لہ شفاء علمہ من علمہ وجہلہ من جہلہ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کینسر میں مبتلا افراد بھی خاصی عمر پاتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ کینسر جسے لاحق ہوا اس کی زندگی کا خاتمہ اسی وقت یقینی ہوگیا۔ مرض کوئی بھی ہو اس سے شفاء اور عدم شفاء کا معاملہ حیات و موت کی طرح قضاء و قدر کی حدود سے باہر نہیں ہے اسی لئے اگر ایک مومن اس مرض میں مبتلا ہوتا ہے تو خود اس کا ایمان ہے کہ اس مرض کی دہشت و خوفناکی اس کی نجات کے لئے کافی ہے۔ اس مرض کا اول عمر میں یا آخر عمر میں لاحق ہوجانا قضاء و قدر میں کسی طرح دخیل نہیں ہوسکتا۔ پیغمبروں اور اللہ کے مقرب بندوں میں سے کتنی مثالیں ایسی گذری ہیں کہ انہوں نے اپنے ایمان کی قوت کے سہارے خود کو لاحق مرض سے تباہ کیا۔

نفسیاتی اصول بھی یہ ہے کہ انسان کی قوت مدافعت اسے مرض کی شدت کو برداشت کرنے کی قدرت عطا کرتی ہے اور اس قوت مدافعت کو بڑھانے میں ایمان کے عنصر کا بڑا ہاتھ ہے بلکہ بعض حالات میں تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایسے افراد سے مرض کے آثار بھی ختم ہوگئے۔ بعضوں کو اس مہلک مرض سے شہد اور آب زمزم کے استعمال سے شفا ملتی ہے اور خوف اور نفسیاتی الجھن ذکر و اوراد اور صدقات سے دور ہوگئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآنی دعائیں اور دم کرنا ان کی اپنی تاثیر ہے تاہم اس میں ضروری چیز ہے صبر اور شفاء میں تاخیر پر رنج و ملال سے دور رہنا۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ مریض کو ٹھیک ہونے میں کئی ماہ یا ایک دو سال لگ جائیں لیکن اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ سورہ فاتحہ کی تکرار تلاوت کے ساتھ سورہ رحمن، یسین، الملک، الطارق، البقرہ، الاخلاص اور معوذتین کی تلاوت سے بھی انشاء اللہ فائدہ ہوگا۔

سوال۔ میں تیس سال کا جوان ہوں۔ میرے بیوی اور بچے بھی ہیں اور زندگی بڑی تنگی سے گذر رہی ہے۔ کوئی کام کے لئے میرے پاس پیسے ہے نہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ میں اپنا گردہ بیچنے پر مجبور ہوگیا ہوں تاکہ کچھ دنوں تک تو پیٹ بھر سکوں۔ عبدالکریم (سندیلہ)

سوال آپ کی مشکلات واقعی بہت تکلیف دہ ہیں لیکن ایک تیس سال کے نوجوان کی طرف سے جو شوہر بھی ہے اور باپ بھی اپنی زندگی کو اس طرح ختم کرنے کا فیصلہ ہمیں عجیب سا لگا۔ آپ کو سوچنا چاہئے تھا کہ اس طرح آپ اپنے اہل خاندان کی ذمے داریوں کو کتنے دن سنبھالیں گے اور گردہ فروخت کردینے کے بعد آپ کی صحت خاص طرح متاثر ہوگی کیونکہ قلب تغذیہ کا شکار آپ پہلے ہی سے ہیں جیسا کہ آپ کی بے روزگاری کے ذکر سے ظاہر

باقی صفحہ ۲۱ پر

Price Rs. 8/-
Special Collective Issue
Jan.,Feb.& Mar.1998

The Milli Times International

Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025
Tel: +91-11-6827018, 6926246 Fax : +91-11- 6946686

RNI # 57337/94
RGD. DL # 11234/96
Vol. 5, Issue : 1

سمندر کے کنارے بیٹھنا اسے بہت اچھا لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ٹھنڈی ٹھنڈی تازہ تازہ ہوا اس کی بے بسی کے غم کو کچھ ہلکا کردے گی۔ اسے ایسا لگتا ہے جیسے اس کا سارا اضطراب خود اس کی اپنی پیدا کردہ صورت حال کا نتیجہ ہو۔ آخر وہ اس قدر سوچتا کیوں ہے دنیا میں مصروف ترین لوگوں کی طرح وہ بھی کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں ڈھونڈ لیتا؟ تاکہ صبح سے شام تک کی مصروفیت، اور مصروفیات کا لامتناہی سلسلہ اور پھر بیچ بیچ میں بہت ساری ان دیکھی مصروفیتیں اس کی زندگی کو شور ہنگامے سے اس قدر بھر دیتیں کہ اسے ان مسائل پر غور و فکر کی مہلت ہی نہ ملتی۔ صبح عام سے مسائل میں طلوع ہوتی اور شام مادے کی دوڑ دھوپ میں غروب ہوجاتی ہے۔

وہ ہر لمحہ کچھ سوچتا ہے، منصوبے بناتا ہے، خیالات کو کمال احتیاط سے ترتیب دیتا ہے، مستقبل کا خواب دیکھتا ہے لیکن ہر لمحہ اسے ایسا لگتا ہے جیسے اس کے خواب اس کے ہاتھوں سے پھسل پھسل جاتے ہوں۔ تو کیا وہ سوچنا بند کردے؟ لیکن جب وہ سوچنے کے عمل کو ترک کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے ایسا لگتا ہے جیسے اسے کوئی خودکشی پر آمادہ کر رہا ہو۔

ساحل سمندر کے دوسری طرف ڈنمارک کا دارالحکومت کوپن ہاؤن آباد ہے جہاں وہ چند دنوں پہلے اسلام اور مغرب کے موضوع پر ایک جلسے سے خطاب کرکے لوٹا ہے، جہاں اس نے اپنی بساط بھر آخری رسولؐ کی امت کا مقدمہ لڑنے کی کوشش کی۔ اپنی صلاحیتوں کا ایک ایک قطرہ نچوڑ ڈالا تب اس نے سامعین کی آنکھوں میں حیرت کی چمک دیکھی، اسے ایسا لگا جیسے وہ اپنے وجدان کا خزانہ لوگوں تک منتقل کرنے میں کامیاب رہا ہو، لیکن جب سامعین میں سے ایک خاتون صحافی نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ آخر آخری ہدایت کے حاملین اور عالمی قیادت کے دعویدار موجود دنیا میں غیر مؤثر اور بے ضرر سی مخلوق کیوں بنادیئے گئے ہیں؟ ۵۶ ممالک کی مسلم دنیا پر بے سمتی اور بے بسی کا ماحول کیوں طاری ہے؟ تمہاری خلافت بقول تمہارے کوئی پون صدی سے غائب ہے پھر تمہاری قوم کے کوئی ڈیڑھ بلین لوگ سکون سے کیسے بیٹھے ہیں؟ تم اگر واقعی کچھ دنیا کو دینا چاہتے ہو تو پہلے اپنے گھر کی درستگی کا سامان کیوں نہیں کرتے؟ اسے حیرت ہوئی کہ جن سوالات تک پہنچنا ایک مغربی صحافیہ کے لئے اتنا آسان ہے وہاں ہمارے اصحاب دانش کی نگاہیں کیوں نہیں جاتیں؟ اگر امت کے زوال اور بے بسی کا سبب خلافت اسلامی کا غیاب ہے تو اسے دوبارہ اس سرزمین پر قائم کرنے کوشش کیوں نہیں کی جاتی؟

ابھی بہت دن نہیں ہوئے جب ناٹو کے دفتر میں ایک صبح امریکی سفیر نے اس سے کہا تھا کہ اگر بوسنیا میں اسلامی بنیاد پرستی کے لئے فضا سازگار ہوگئی تو یورپ کا مستقبل داؤ پر لگ جائے گا۔ بظاہر تو اسے یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی کہ جس امت کا سیاسی شیرازہ منتشر ہو، جس کے پاس کوئی عالمی قیادت نہ ہو اور جس پر دنیا بھر میں ذلت کا دردناک عذاب طاری ہو بھلا اس کے مٹھی بھر لوگ مغرب کی دیوہیکل تہذیب کے لئے کیونکر خطرہ بن سکتے ہیں؟ لیکن جب اسے بوسنیائی کیمپوں میں بے سہارا نوجوان لڑکے لڑکیوں سے براہ راست ملاقات کا موقع ملا تو وہ ان کے عزائم کا درجہ حرارت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس امت پر زوال جتنا بھی آیا ہو ایسا محسوس ہوتا تھا اس کا اندرون شرار آرزو سے خالی نہیں۔

اسے خیال آیا ہندوستان کوئی یورپ نہیں جہاں اسلام کی جڑیں تازہ تازہ ہوں۔ پھر یہ نکتہ سابق دارالاسلام کے علماء و دانشور کی نگاہوں سے اوجھل کیوں ہے؟ آخر کیا وجہ ہے کہ پچیس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کی شیرازہ بندی کے لئے کوئی مؤثر قدم نہیں [illegible] عملی طور پر مسلمانوں کے اکابرین نے ملی زندگی کی تنظیم کے سارے منصو[illegible] مشرکین کے ہاتھوں میں سونپ دیئے ہیں۔

مغرب ہو یا مشرق ہر طرف سے ایک ایسے اسلام کے ظہور کا مطالبہ ہے جو اپنے ماننے والوں کو جاہ و حشمت سے ہم کنار کرسکتا ہو، جس کے ماننے والے آخرت ہی میں نہیں بلکہ اس دنیا میں بھی ناقابل تسخیر قوت کی حیثیت سے سامنے آتے ہوں۔ گویا ایک ایسے عملی ماڈل کے قیام کا مطالبہ ہے۔ جو نئی زندگی کی تمام پیچیدگیوں کو کمال عدل کے ساتھ برتنے کا سلیقہ سکھاتا ہو ورنہ محض اوراد و وظائف سے روحانی کمالات کا سلسلہ طے کرلے کے لئے تو دنیا کے دوسرے مذاہب میں بھی بہت سی ترکیبیں بتائی گئی ہیں۔ اسلام کا مطلوب روحانی پیر و فقیر پیدا کرنا نہیں بلکہ اس سرزمین پر قرآن کریم کی رہنمائی میں ایک معاشرہ برپا کرنا ہے پھر جو لوگ بڑے آرام سے اسلامی زندگی کا لطف لے رہے ہیں، جو اٹھتے بیٹھتے اپنی مغفرت کے لیے اوراد و وظائف میں منہمک ہیں جنہیں اپنی مغفرت کی تو بہت فکر ہے لیکن اسلام کو مغلوب دیکھ کر ان کے دل و دماغ مضطرب نہیں ہوتے، ہاتھ پیر حرکت میں نہیں آتے کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کا دین محض ان کی نفسیاتی تسکین کا سامان ہے۔ ورنہ آخر کیا وجہ ہے کہ خلافت اسلامی کے غیاب کو پوری امت نے ٹھنڈے پیٹوں سکون سے برداشت کیا ہوا ہے اے کاش کہ لوگ اس شخص کی بات سمجھ پاتے۔

